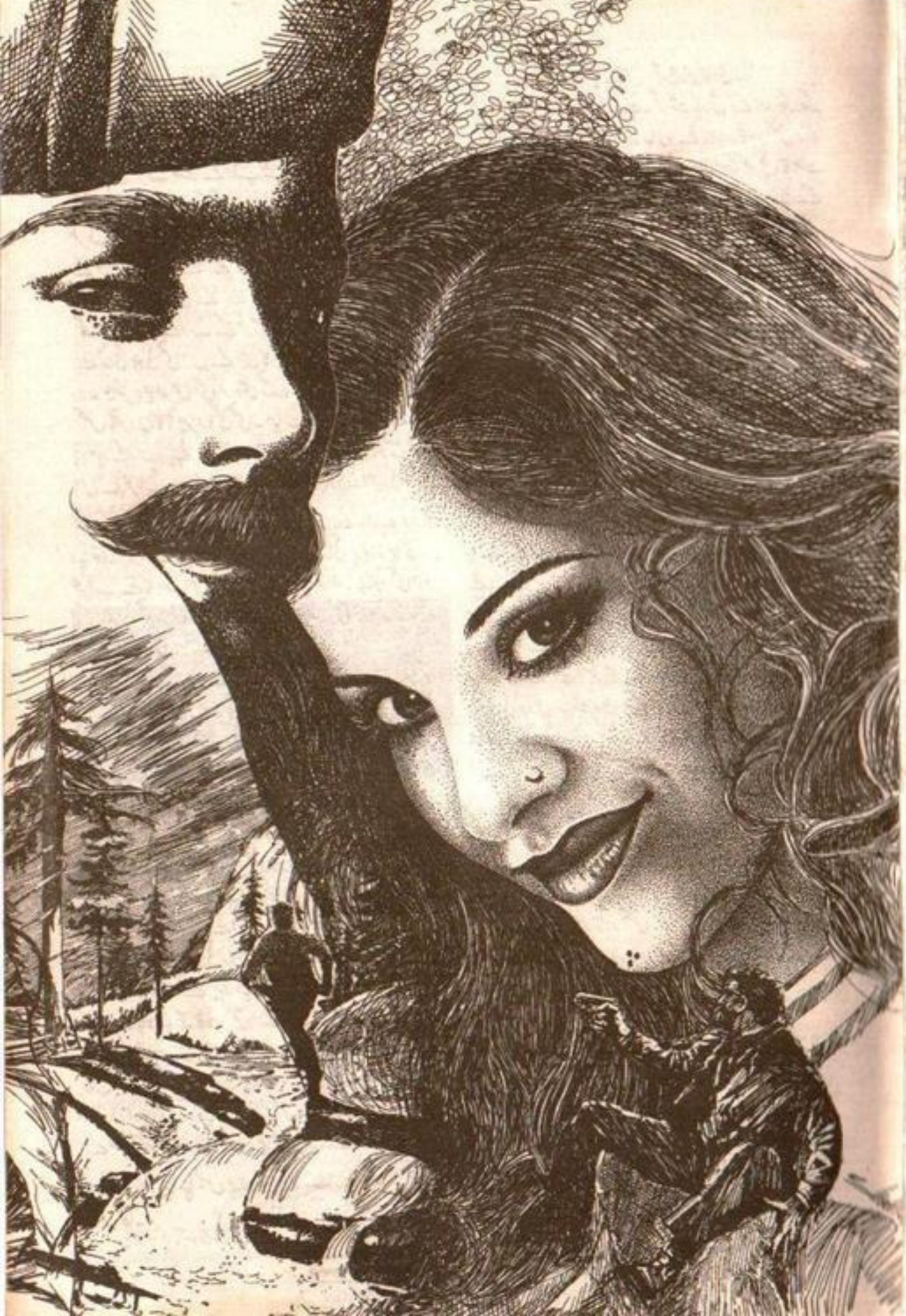

دِ توبہ

کاشف زبیر

یہ دنیا دارالاسباب ہے ... یعنی یہاں ہر عمل کا کوئی نہ کوئی سبب ہے۔ لیکن اس بدیع العجائب کی ذات اپنی مشیت میں کسی سبب کی محتاج نہیں۔ وہ جس امر کا ارادہ کرتا ہے، کُن کہتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے ... اور حقیقت تو یہ ہے کہ لفظ کُن بھی ہم انسانوں کی... جاہلوں کو سمجھانے کے لیے ہے ورنہ اس بے نیاز کو اس کی احتیاج نہیں! یہ بے کراں کائنات اس میں کارفرما حقائق اور واقعات، آشکارا اسباب و علل... اور سربستہ راز ... سب اس قادرِ مطلق کی قدرت کا پرتو ہیں۔ اس کے حضور سوائے دعا کے، توبہ کے، رحم کی درخواست کے کوئی محال نہیں کی جا سکتی۔

گناہ گاروں کو استغفار پر مائل کرتی، توبہ کی توفیق سے سرفراز افراد کی داستان

وہ دروازے کے سامنے ساکت کھڑی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ فضا خنک تھی مگر اس کا جسم کسی اور خیال سے سرد پڑ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں سوٹ کیس لیے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے..... ؟ اس دروازے کو پار کرے یا نہ کرے؟ اگر وہ اس دروازے کو پار کر لیتی تو کمان سے نکلا تیر بن جاتی جو کبھی واپس نہیں آتا۔ پھر وہ اس گھر کی عزت نہیں..... اس عزت پر دھبا بن جاتی۔ اس کی واپسی کی کوئی راہ باقی نہ رہ جاتی۔

اس گھر میں اس کے ماں باپ اور بھائی تھے..... اس کی بچپن کی یادیں اور محبتیں تھیں۔ اس کے دکھ، اس کے سکھ تھے..... اور اس گھر کے دروازے کے باہر اس کی محبت تھی۔ اسے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ انتخاب اس نے کر لیا تھا لیکن عین دروازے کے سامنے آ کر کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا۔ باہر نہ جائے..... یہ قدم نہ اٹھائے..... جو اسے کبھی نہ واپس آنے والے ایک سفر پر لے جائے گا۔ اس کی اندرونی کشمکش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کیا کرے..... جائے یا نہ جائے؟ اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

حیات خان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مشرق سے ہلکی سی روشنی نمودار ہو چکی تھی مگر ستارے نظر آ رہے تھے۔ فضا میں جنگلی نباتات اور پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ وہ احتیاط سے سر جھکائے نیچے اترنے لگا۔ ذرا سی غلطی اسے سیکڑوں فٹ گہرائی میں پہنچا دیتی۔ تاریکی کے باوجود اسے اعتماد تھا، یہ راستہ اس کے پیروں کو ازبر تھا۔ سیکڑوں بار وہ اس جگہ سے گزر چکا تھا۔ نشیب سے پانی بہنے کی ہلکی سی آواز آ رہی تھی۔ دو روز سے موسم خشک تھا اس لیے اسے امید تھی کہ نالے میں پانی کم ہوگا۔ برسات میں یہ نالہ بپھرے دریا میں بدل جاتا تھا اس وقت اسے پار کرنے کا واحد ذریعہ پل رہ جاتا تھا جو اس جگہ سے چار میل اوپر تھا۔

حیات خان نے پانی میں پاؤں رکھا۔ پانی کسی قدر سرد تھا۔ اکتوبر کے آغاز میں پوٹھوہار کے علاقے کا موسم بدل جاتا تھا۔ اس نے آرام سے نالہ عبور کیا۔ پانی اس کے گھٹنوں سے کچھ اوپر تک آیا تھا۔ اس نے شلوار کے پائنچے جھاڑے اور اوپر چڑھنے لگا۔ حیات خان نے اوپر چادر لے رکھی تھی۔ جب تک وہ اوپر پہنچا، روشنی اتنی ہو گئی تھی کہ ستارے غائب ہو گئے اور آسمان کی رنگت نیلگوں ہونے لگی تھی۔ حیات خان نے بلندی سے دور ناگن کی طرح بل کھا کر پہاڑوں میں غائب ہوتی، جی ٹی روڈ کی جھلک دیکھی۔ اسے روڈ تک جانا تھا۔ وہاں قادر بخش اس کا منتظر ہوتا لیکن اس سے پہلے اسے ایک کام اور کرنا تھا۔ وہ روڈ کی طرف جانے کے بجائے دائیں طرف مڑا۔ اس طرف گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ سطح مرتفع پوٹھوہار کا بیشتر حصہ سرسبز ہے لیکن درختوں کے

UrduPhotos.com

بجائے جھاڑیاں زیادہ ہیں۔ کہیں کہیں شیشم، فراش اور بیری کے درخت نظر آتے ہیں یا لوگوں نے ذاتی زمینوں پر سفیدہ لگا رکھا ہے۔

اس طرف جھنڈ کے عقب میں ایک بیس پچیس فٹ بلند ٹیلے پر کسی شکستہ مسجد کے کھنڈرات تھے۔ کسی زمانے میں اس طرف آبادی تھی پھر نامعلوم وجہ سے آبادی اجڑ گئی۔ شاید پانی کے چشمے خشک ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے لوگ نقل مکانی کر گئے۔ مکان کچی مٹی کے بنے تھے اس لیے جلد گر گئے اور پھر گھاس پھوس تلے دب گئے مگر مسجد کی سادہ سی عمارت پتھروں سے بنائی ہوئی تھی اس لیے اس کا محراب والا حصہ برقرار تھا۔ ورنہ بیشتر دیواریں بھی گر چکی تھیں۔ بیرونی چار دیواری تو محض پتھروں کا ڈھیر رہ گئی تھی۔ حیات خان نے احاطے میں قدم رکھنے سے پہلے جوتے اتار دیے تھے۔ یہ اس کا وضع تھا۔ اس نے محراب والے حصے میں جا کر اذان دی۔ اس کی دھیمی لیکن گونجتی آواز نے چند لمحے کے لیے مسجد کے سناٹے کو توڑ دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے وہاں بچھی چٹائی پر نماز پڑھی۔ محراب تلے کا حصہ اس نے خود صاف کیا تھا اور چٹائی بھی خود لا کر بچھائی تھی۔ دور سے محراب کا یہ حصہ کسی دروازے کی طرح نظر آتا تھا۔

نماز پڑھ کر اس نے ایک کونے میں رکھی جھاڑو اٹھا کر محراب والے حصے کی صفائی کی اور چٹائی ایک طرف لپیٹ کر رکھ دی۔ باہر روشنی پھیل رہی تھی۔ مشرق سے سورج نے سر نکال لیا تھا۔ ہوا میں ایک نامحسوس سی سرسراہٹ اور ہلکی سی گرمی آ گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر چل پڑا۔ جھنڈ سے گزر کر اس نے سڑک تک جانے کے لیے ایک اور راستہ اختیار کیا تھا۔ اس جگہ سے مسجد نظر نہیں آتی تھی اور سڑک سے تو بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔ مسجد کے کھنڈرات کو درختوں نے اس طرح ڈھانپ لیا تھا کہ صرف بلندی سے انہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

حیات خان جی ٹی روڈ کے کنارے پہنچا۔ اسے قادر بخش نظر نہیں آیا تھا۔ اسے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید وہ آج نہیں آیا پھر اسے یاد آیا کہ قادر بخش نے اسے سرخ چٹان کے پاس ملنے کو کہا تھا۔ سرخ چٹان سڑک سے ذرا فاصلے پر تھی۔ حیات خان نے لاہور والی سمت چلنا شروع کر دیا۔ چٹان اس جگہ سے ذرا دور تھی۔ وہ چٹان کے پاس پہنچا، قادر بخش اسے دور سے نظر آ گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر سڑک کے کنارے آ گیا۔ قادر بخش تقریباً چالیس برس کا سانولے سے رنگ کا تنومند شخص تھا۔

''کیا بات ہے حیاتے..... آج دیر کر دی۔''

''ہاں، راستہ خراب ہے۔ گزشتہ بارش کے بعد جگہ جگہ سے مٹی گر رہی ہے۔'' حیات خان نے بتایا۔ قادر بخش کے برعکس وہ سرخی مائل سفید رنگ کا پستہ جسم والا نسبتاً طویل قامت شخص تھا، عمر تیس کے آس پاس تھی۔ وہ خوش شکل ہونے کے باوجود بے تاثر چہرے اور خمار آلود آنکھوں کی وجہ سے غیر نمایاں لگتا تھا۔ قادر بخش کے نقوش کھردرے تھے لیکن ان میں کچھ ایسی بے چینی تھی کہ دیکھنے والا توجہ دیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ قادر بخش نے گھڑی دیکھی۔

''بس آنے والی ہے۔''

ساڑھے سات بج رہے تھے۔ راولپنڈی سے گوجرانوالہ جانے والی کوچ صبح چھ بجے روانہ ہوتی تھی اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جی ٹی روڈ پر اس مقام تک آتی تھی۔ اتنی صبح ٹریفک کم تھا، صرف مال بردار ٹرک نظر آ رہے تھے جو ساری رات سفر کرنے کے بعد صبح کے وقت جھگی ہوٹلوں کے سامنے رک جاتے تھے۔ وہ دونوں سڑک کے کنارے آ کھڑے ہوئے تھے۔ ملک شیر سروس کی کوچ راولپنڈی والی سمت سے نمودار ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی حیات خان اور قادر بخش سڑک کے وسط میں آ گئے تھے۔ جیسے ہی بس نزدیک آئی، انہوں نے اپنی چادروں تلے سے اسلحہ نکال لیا۔ قادر بخش کے پاس چھوٹے سائز کی روسی ساختہ ری پیٹر تھی جبکہ حیات خان کے پاس ماؤزر پستول تھا۔ قادر بخش نے ری پیٹر کا رخ بس ڈرائیور کی طرف کیا تو اس نے حسب توقع بریک لگا دی۔ کبھی کبھی بس ڈرائیورز کا ردعمل غیر متوقع بھی ہوتا تھا وہ بس اچانک دوڑا دیا کرتے تھے لیکن قادر بخش اور حیات خان اس قسم کی صورت حال کے لیے ہمیشہ تیار ہوتے تھے اس لیے بچنے میں کبھی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

بس رکتے ہی قادر بخش نے اشارے سے ڈرائیور کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور نے لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھولنے والا ہینڈل کھینچ لیا۔

☆☆☆

رابعہ نے سانس روک کر کنڈی کھولی۔ اس نے گزشتہ روز اسے تیل دیا تھا اس کے باوجود اسے خدشہ تھا کہ کنڈی کھولنے سے آواز ضرور آئے گی۔ رات ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے گھر والے اندر سو رہے تھے۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ کنڈی ہلکے سے کھٹکے سے کھلی۔ اس نے ہراساں نظروں سے اندر کی طرف دیکھا۔ جب کوئی ردعمل نہیں ہوا تو اس نے

سکون کی سانس لی تھی۔ ہاتھ میں تھاما بیگ اس نے مضبوطی سے پکڑا اور دروازہ کھول کر باہر گلی میں آ گئی۔ عقب میں اس نے دروازہ بے آواز بھیڑ دیا۔ جب وہ دروازے سے نکل رہی تھی تو اس کا ہاتھ الگ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی نے اس کے اندر سے کہا۔

''رابعہ یہ کیا کرنے جا رہی ہے.....؟ ماں باپ کی عزت کا سوچ۔''

''ماں باپ کی عزت۔'' اس نے تلخی سے سوچا۔ ''جو مجھے بھیڑ بکری سے زیادہ نہیں سمجھتے..... جس کھونٹے میں چاہیں باندھ دیں۔''

رابعہ کی کہانی روایتی تھی۔ راولپنڈی کے ایک نواحی محلے میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والی رابعہ عام سی لڑکی تھی۔ مخصوص خاندانی ماحول..... جس میں لڑکیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی، صرف بیٹے ہی سب کچھ تھے۔ رابعہ کے چار بھائی تھے اور اس سے پیار کرتے تھے لیکن اس سے زیادہ عزیز اس سے وابستہ اپنی عزت کو رکھتے تھے۔ رابعہ نے جوانی کی حدوں میں قدم رکھا تو بھائیوں کے اندر اندیشوں کے ناگ سرسرانے لگے۔ وہ رابعہ کو یوں دیکھتے جیسے اس کے اندر کوئی سانپ چھپا ہو جو موقع پاتے ہی ان کی عزت کو ڈس لے گا۔ بہ مشکل انہوں نے اس کا اسکول تک جانا برداشت کیا اور جس روز وہ میٹرک کا آخری پرچہ دے کر آئی تھی، بھائیوں نے اس سے کہہ دیا کہ اب وہ گھر میں رہے گی، اس کا باہر جانا بند۔

''مگر کیوں بھائی؟'' اس نے سب سے بڑے فضل بھائی سے پوچھا۔ ''ابھی تو میں نے کالج جا کر پڑھنا ہے۔''

''بکواس نہ کر۔'' دوسرے نمبر کے بھائی رحمان نے اسے جھڑکا۔ ''بہت پڑھ لیا، آرام سے گھر بیٹھ..... باہر جانے کی بات کی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

رابعہ سہم گئی تھی۔ وہ ماں کے پاس آ گئی۔ ''ماں، بھائی مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟''

ماں نے اسے سمجھایا۔ ''ناراض نہیں ہیں۔ اب تو بڑی ہو گئی ہے..... ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ نہیں پڑھایا جاتا۔''

''ماں..... نورین باجی اور صوبی نے بھی تو کالج میں پڑھا ہے۔''

''پڑھا ہو گا لیکن تیرے بابا اور بھائی تجھے آگے پڑھانے کے حق میں بالکل نہیں ہیں۔''

وہ باپ کی لاڈلی تھی۔ ان سے اپنی ضدیں منوا لیا کرتی تھی۔ بلکہ جو بات ماں نہیں مانتی تھی اس پر بابا راضی ہو جاتے تھے مگر جب اس نے باپ سے آگے پڑھنے اور کالج جانے کی ضد کی تو اس کا ردعمل بھائیوں سے بھی زیادہ سخت نکلا۔ ''تجھے کالج جانے اور آگے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جتنا پڑھ لیا، کافی ہے۔ اب آرام سے گھر میں بیٹھ۔''

یہی نہیں بلکہ اس کے باپ نے سختی سے اس کی ماں سے کہہ دیا کہ اب رابعہ باہر نہیں جائے گی اور اس کے لیے رشتہ تلاش کرے۔ رابعہ نے رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں لیکن اس کے بھائیوں اور باپ نے ذرا بھی پروا نہیں کی۔ ماں اسے سمجھاتی تھی اور جب بیزار ہو جاتی تو کہتی۔ ''رابو! بے شک تو سر پٹخ کر مر جا لیکن تجھے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں ملے گی۔''

ممکن ہے رابعہ آج سے بیس تیس سال پہلے کی لڑکی ہوتی جب لڑکیوں کے لیے میٹرک کر لینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا تو شاید وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتی۔ اس کے محلے کی تقریباً ساری لڑکیاں کالجوں میں بلکہ یونیورسٹی تک میں پڑھ رہی تھیں۔ اب لڑکیوں کو زیادہ پڑھانا اچھا سمجھا جاتا تھا..... اور اس کے

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

ہر سال ہزاروں سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی وجہ سے امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے کے لیے اپنے تجربہ تحقیقات اور تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بیماروں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور ہمیں گئے گزرے کمزور جوان ایک ایک خط آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جوہر واقعی بے مثال کامیاب کارگر ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پر سرخی اور ہڈیوں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جاتی ہیں جسکے لیے آپ ایک مدت سے محروم ہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

UrduPhoto.com

باپ بھائی اسے میٹرک سے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

اس علاقے میں دو بڑی برادریاں آباد تھیں اور دونوں برادریوں میں نہیں بنتی تھی۔ رابعہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی کہ اس کے ماں باپ اور بھائی مخالف برادری کا ذکر حقارت سے کرتے تھے۔ ان کو خود سے کم تر سمجھتے تھے اور یہی حال دوسری برادری کا تھا۔

مسئلہ آج سے کوئی تیس سال پہلے شروع ہوا تھا۔ ایک برادری کی لڑکی نے دوسری برادری کے لڑکے کے ساتھ چھپ کر شادی کرلی تھی۔ وہ تو فرار ہوگئے تھے اور ان کا کچھ اتا پتا بھی نہیں چلا تھا مگر اس کے بعد سے دونوں برادریوں میں ٹھن گئی تھی۔ محلے میں برابر کی چوٹ تھی اور کوئی دوسرے سے دبنے یا مفلہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک دوسرے سے بات چیت اور لین دین بند تھا۔ اپنی برتری جتانے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ ہر شعبے میں جاری تھی۔ اگر کوئی شخص دو منزلہ مکان بناتا تو دوسری طرف لازماً تین منزلہ مکان بنتا تھا..... اگر کوئی برادری کے لوگ اپنے کسی بزرگ کی برسی پر دس دیگیں بنواتے تھے تو مخالفوں کے لیے بیس دیگیں بنوانا زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ اب دونوں ہی اپنی نوجوان نسل پر خاص نظر رکھتے تھے اور ایک دوسرے سے ملنا گناہ سے کم نہیں تھا۔ خاص طور سے لڑکیوں پر روک ٹوک کی جاتی تھی۔

رابعہ رودھو کر چپ ہوگئی تھی لیکن یہ بات اس کے دل میں بیٹھ گئی کہ اس کے باپ بھائیوں نے اس پر ظلم کیا ہے۔ اسے کالج میں پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ راجا برادری کی زیادہ لڑکیاں کالجوں میں پڑھ رہی تھیں اور شاید اس کے ماں باپ کو خدشہ تھا کہ وہ ان لڑکیوں سے گھلے ملے گی لہٰذا اسے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ جب وہ کالج میں داخلہ نہ لے سکی تو اس نے پرائیویٹ ایف اے کرنے کا سوچا۔ خلاف توقع اس کی اجازت مل گئی اگرچہ بھائیوں نے اس پر بھی ہنگامہ کیا تھا مگر باپ مان گیا۔

"کیا ہوا..... گھر بیٹھے تو پڑھے گی۔" اس نے بھائیوں سے کہا۔

"پرچے دینے تو جائے گی۔"

"تم میں سے کوئی اس کے ساتھ چلا جایا کرے گا۔" باپ نے بات ختم کردی۔

یوں رابعہ نے آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے خود کو تسلی دے لی تھی۔ کیا ہوا جو وہ کالج نہ جاسکی۔ آگے تو پڑھ رہی تھی۔ نصابی تعلیم کے ساتھ اسے مطالعے کا شوق بھی تھا۔ جب ماں کے ساتھ بازار جانا ہوتا تھا تو وہ اپنی پاکٹ منی سے کوئی نہ کوئی اچھی کتاب لے آتی تھی۔ مطالعے کے لیے خاص پسند نہیں تھی، وہ ناول اور افسانے پسند کرتی تھی۔ خالصتاً ادبی کتب بھی، مزاح اور سفرنامے بھی پڑھتی تھی لیکن مطالعے کا یہ شغل سب سے چھپ کر رات کو اپنے کمرے میں ہوتا تھا۔ بھائیوں کو اس کا کتابیں پڑھنا بھی پسند نہیں تھا۔

اس نے ایف اے کیا۔ ان دنوں اس کا ایک رشتہ آیا تھا اور ماں باپ راضی تھے کہ اچانک رحمان بھائی کی لڑکے کے خاندان میں کسی سے دشمنی نکل آئی تھی لہٰذا انکار کردیا گیا۔ خاندان میں اتفاق سے اس کے جوڑ کا کوئی لڑکا تھا ہی نہیں۔ وہ بی اے کی تیاری کرنے لگی۔ ایف اے کی طرح بی اے بھی پرائیویٹ تھا۔ اس دوران میں فضل کویت چلا گیا تھا اور وہاں جاکر اس نے چند مہینے بعد رحمان اور اس سے چھوٹے عمران کو بھی بلوا لیا تھا۔ سب سے چھوٹا فیضان ان دنوں ٹیکسلا انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ اچانک تین جوان لڑکوں کے چلے جانے سے گھر خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔ زندگی میں پہلی بار رابعہ نے بھی بھائیوں کی کمی شدت سے محسوس کی تھی۔ خاص طور سے جب بی اے کے پہلے سال کے پرچے دینے کے لیے اسے اکیلا جانا پڑا تھا۔ وہ چوتھا پرچہ دینے کے بعد سینٹر سے نکلی تو طوفانی قسم کی بارش جاری تھی مگر وہ پریشان نہیں ہوئی تھی۔ اس قسم کی بارش اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ چھتری لائی تھی۔ وہ بس اسٹاپ تک آئی۔ وین خاصی دیر سے آئی تھی اور طوفانی بارش میں اس میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ حد یہ کہ اگلے حصے میں جہاں صرف عورتیں بیٹھ سکتی تھیں، وہاں بھی دو مرد بیٹھے تھے۔ ایک جگہ خالی تھی۔

"میں کیسے بیٹھوں؟" رابعہ نے پریشانی سے کہا۔ "ان کو اتارو۔"

"بی بی آنا ہے تو آؤ..... ہمیں کیوں اتراتی ہو۔" ایک نے کہا۔

"ہم تمہیں کھا تو نہیں جائیں گے۔" دوسرا خباثت سے بولا تھا۔

"بکواس مت کرو۔" پیچھے بیٹھے ایک نوجوان نے کہا۔ "ایک لڑکی سے اس طرح بات کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"اوئے تجھے کیا مسئلہ ہے۔" دوسرے نے پلٹ کر کہا۔ "تیری سگی....."

نوجوان نے بے قابو ہوکر اس کا گریبان پکڑ لیا لیکن اس سے پہلے کہ جھگڑا بڑھتا کنڈیکٹر نے بیچ بچاؤ کرایا اور نوجوان کو وین سے اتار دیا۔ رابعہ پریشان اور شرمندہ تھی۔ اس نے بھیگتے نوجوان سے کہا۔

"سوری..... میری وجہ سے آپ کو بھی وین سے....."

"نہیں..... نہیں ایسی بات نہیں ہے، یہ تو میرا فرض تھا۔ آخر آپ میرے محلے میں رہتی ہیں۔"

رابعہ چونکی۔ "آپ ہمارے محلے میں رہتے ہیں؟"

"آپ کے گھر سے پانچواں گھر ہے۔ میں اسلم راجا کا بیٹا ہوں..... سلیم راجا۔"

ان کی گلی میں آباد اسلم راجا کا خاندان واحد خاندان تھا جس کی تعریف اس کے باپ بھائی بھی کرتے تھے اور ان کو شریف قرار دیتے تھے۔ "اچھا..... تبھی آپ مجھے جانے جانے سے لگ رہے تھے۔" رابعہ نے کہا اور شرما گئی۔ اسے یہ نوجوان اچھا لگا تھا۔ "آپ کا شکریہ۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" سلیم نے سڑک پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک ٹیکسی دیکھ کر اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جب ٹیکسی آکر پاس رکی تو اس نے رابعہ سے کہا۔ "کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟"

رابعہ کا دم خشک ہوگیا۔ "نہیں، یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

"اس وقت کوئی اور ٹرانسپورٹ مشکل سے ملے گی۔ بہتر ہے آپ آجائیں..... میں آپ کو اسٹاپ پر اتار دوں گا، وہاں سے پیدل چلی جایئے گا۔"

رابعہ نے غور کیا اور اس کی بات معقول لگی۔ محلے میں وہ سلیم کے ہمراہ ٹیکسی میں نہیں جاسکتی تھی۔ کوئی نہ کوئی دیکھ لیتا۔ ہاں، اسٹاپ پر اتر جاتی تو کوئی نہ دیکھتا۔ وہ جگہ عام طور سے سنسان رہا کرتی تھی۔ رابعہ ہچکچاتی ہوئی عقبی حصے میں آبیٹھی اور سلیم ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیس منٹ بعد رابعہ بس اسٹاپ پر اتر رہی تھی۔ اس نے سلیم کا شکریہ ادا کیا۔

"کوئی بات نہیں، یہ میرا فرض تھا۔" سلیم نے کہا۔

رابعہ ٹیکسی کو جاتا دیکھتی رہی تھی۔

پھر پتا نہیں کب پسندیدگی کا جذبہ محبت میں بدل گیا۔ ایک محلے میں ہونے کی وجہ سے ان کا آمنا سامنا ناممکن نہیں تھا۔ اگرچہ دونوں گھرانوں کے لوگ کبھی ایک دوسرے کے گھر نہیں آتے جاتے تھے، اس کے باوجود گلی میں آمنا سامنا ہوجاتا تھا۔ بھائی موجود نہیں تھے اس لیے رابعہ گھر سے نکلنے لگی تھی۔ محلے میں کئی رشتے دار رہتے تھے، ان کے ہاں آنا جانا ہوتا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے ایک دو الفاظ کا تبادلہ ہوتا تھا۔ پھر ایک روز وہ جارہی تھی کہ ایک پتھر اس کے قدموں میں آکر گرا، اس پر کاغذ لپٹا تھا۔ پتھر سلیم نے اپنے گھر کی چھت سے پھینکا تھا۔ رابعہ نے خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اتفاق سے گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے جھک کر پتھر اٹھالیا۔

☆☆☆

سلیم بے تابی سے انتظار کررہا تھا۔ رابعہ سے اس نے کہا تھا کہ ان کو چار بجے نکلنا ہے۔ بس اسٹاپ پر اس کا دوست گاڑی لیے ان کا منتظر ہوتا۔ سوا چار بج چکے تھے اور ابھی تک رابعہ نظر نہیں آئی تھی۔ بے چین ہوکر اس نے رابعہ کے مکان کی طرف قدم اٹھایا ہی تھا کہ اسے نیم تاریکی میں ایک سایہ آتا دکھائی دیا۔ سلیم رک گیا۔ وہ سائے کے نزدیک آنے کا انتظار کررہا تھا پھر اسے اندازہ ہوا کہ وہ رابعہ ہے۔ سلیم بے تابی سے اس کی طرف بڑھا اور اس نے آہستہ سے پکارا۔ "رابعہ!"

"سلیم!" رابعہ کی دھیمی آواز آئی۔

سلیم نے اس سے بیگ لے لیا۔ "دیر مت کرو..... کچھ دیر میں اذانیں شروع ہوجائیں گی۔ لوگ باہر آجائیں گے۔"

"سلیم!" رابعہ نے سسکی لی۔ "کیا ہم ٹھیک کررہے ہیں؟"

"رابعہ اب سوچنے کا وقت گزر چکا ہے۔ کوئی جاگ گیا تو ہم پھنس جائیں گے۔"

ہر گھر کی ضرورت

بے نظیر اور بے مثال پروڈکٹس

جمیلی تیل کا استعمال بدن کی تھکاوٹ کھنچاؤ گردن کمر جوڑوں کا درد دور کرے قیمت فی بوتل 340 روپے علاوہ محصول ڈاک خرچ 50 روپے۔

سکون ہیئر ٹانک سر کی خشکی دور بالوں کو مضبوط کرکے بڑھائے بالوں کو لمبا گھنا سیاہ چمکدار جوئیں لیکھیں بھی کرے قیمت فی بوتل 200 روپے علاوہ محصول خرچ 50 روپے۔

فارمولا F-5 چہرے پر پیدا شدہ فاضل بالوں سے نجات کا طریقہ اب آپکو بار بار تھریڈنگ ویکسنگ کی ضرورت نہیں یہ ایک خاص بنیاں ہیں جن کے آسان استعمال سے فاضل بالوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے قیمت فی پیکنگ 400 روپے علاوہ محصول خرچ 50 روپے۔

گھر بیٹھے ایک مرتبہ کراچی پارسل سے طلب فرمائیں کوئی بھی دو یا اس سے زائد اشیاء منگوانے پر محصول خرچ معاف ہوگا۔

فیئری پرفیومرس ہاؤس نمبر 2209 کراچی۔ 74600

رابعہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کے انداز میں بے دلی تھی پھر سلیم کا ساتھ دینے کے لیے وہ تیز قدم اٹھانے لگی تھی۔ سلیم نے اس کے بیگ کے ساتھ اپنا بھی ایک مختصر سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ بس اسٹاپ کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ سنسان اور تاریک گلیوں سے گزر کر وہ پانچ چھ منٹ میں وہاں جا پہنچے۔ رابعہ کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ آخری بار ان گلیوں کو دیکھ رہی ہے جن میں کھیلتے اور چلتے پھرتے اس کا بچپن گزرا تھا۔

''رابعہ گاڑی میں بیٹھو۔'' سلیم نے دوسری بار کہا تو وہ چونکی تھی۔ سلیم اس سرمئی کار کا دروازہ کھولے کھڑا تھا جسے اس کا دوست چلا رہا تھا۔ رابعہ کے اندر بیٹھتے ہی سلیم نے تیزی سے دروازہ بند کیا اور گھوم کر فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے دوست سے کہا۔ ''اب چلو..... دیر مت کرو۔''

''یار، تو نے سوچ لیا ہے؟'' دوست نے دبی زبان میں کہا تھا۔ ''تیرے ماں باپ، بہن بھائی ہیں۔''

''ہاں..... ہاں میں نے سوچ لیا ہے۔'' سلیم نے جھنجلا کر کہا۔ ''اب چلو.....''

دوست نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ان کا رخ بس اڈے کی طرف تھا۔ وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ سلیم کا ایک دوست گوجرانوالہ میں تھا۔ وہ اس کے پاس جاتے..... ان کے نکاح کا بندوبست بھی اس نے ہی کرنا تھا۔ اس کے بعد سلیم اور رابعہ کراچی چلے جاتے۔ وہاں بھی سلیم کے کچھ جاننے والے تھے۔ ان کے توسط سے وہ رہائش اور روزگار کا بندوبست کر سکتا تھا۔

رابعہ اپنے سارے زیورات لے آئی تھی جو ماں اسی وقت سے اس کے لیے بنا رہی تھی جب اس نے اپنے پیروں پر چلنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ تقریباً ساٹھ تولے کے ان زیورات کی مالیت لاکھوں میں تھی۔ سلیم نے کہا تھا کہ وہ بس دو لاکھ روپے ساتھ لائے گا یعنی ان کو کم سے کم سال بھر تک کوئی مالی مسئلہ نہیں ہوتا۔ جب وہ آئندہ کا پروگرام طے کر رہے تھے تو رابعہ نے کہا۔ ''تم میرا زیور بیچ کر کوئی کاروبار کر لینا۔''

''نہیں..... میں نے سوچ لیا ہے..... میں جاب کروں گا۔ میرے پاس ایسوسی ایٹ انجینئر کا ڈپلوما ہے۔ کہیں نہ کہیں جاب مل ہی جائے گی۔'' سلیم نے کہا تھا۔ ''میں تمہیں اپنے بازوؤں کے زور پر کھلانا چاہتا ہوں۔''

رابعہ اندر سے خوش ہوئی تھی۔ سلیم نے اس سے کہا تھا کہ ہم کراچی جا کر کوئی چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیں گے۔ چھ سات مہینے گزارے لائق رقم ہے۔ اس کے بعد کہیں نہ کہیں جاب مل جائے گی۔

''انشاء اللہ۔'' رابعہ نے کہا تھا۔ ''کاش ہمارے گھر والے مان جاتے۔''

''ہمارے نہیں، تمہارے گھر والے۔'' سلیم نے تلخی سے کہا تھا۔ ''میرے ماں باپ میری ضد پر رشتہ لے کر گئے تھے اور تمہارے گھر والوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔''

''سلیم، ان کا رویہ بھی درست نہیں تھا۔ انہوں نے بات کرنے سے پہلے جتا دیا تھا کہ یہ رشتہ لانا ان کی مجبوری تھی ورنہ وہ کبھی ہمارے گھر رشتہ لے کر نہ آتے۔''

''پھر بھی تمہارے ماں باپ انکار کر دیتے۔ جو انہوں نے کیا اس کے بعد میرا کیا منہ رہ گیا تھا کہ میں اپنے ماں باپ سے پھر رشتہ لے جانے کو کہتا۔''

رابعہ الفاظ میں وضاحت نہیں کر پا رہی تھی۔ سلیم کے ماں باپ کا رویہ ایسا تھا کہ رابعہ کے گھر والے اشتعال میں آ گئے تھے اور اس کے بعد بدمزگی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے گھر واپس جا کر سلیم کے سامنے رابعہ کے ماں باپ کا رویہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا جس سے سلیم اشتعال میں آ گیا تھا اور اس نے رابعہ سے کہہ دیا تھا کہ اب اسے اس کا ساتھ دینا ہوگا۔ شروع میں رابعہ نے گھر سے بھاگ کر کورٹ میرج کر لینے کی تجویز ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا لیکن جب سلیم نے اسے بتایا کہ اس صورت میں ان کے پاس ہمیشہ کی جدائی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے تو اس کا دل پسیج گیا تھا اور وہ نہ نہ کرتے بالآخر رضامند ہو گئی تھی۔ سلیم سے ہمیشہ کی جدائی کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا۔

کار دھچکے سے رکی تو رابعہ خیالوں سے چونکی تھی۔ بس اڈا آ گیا تھا۔ یہاں سے پورے ملک کے لیے کوچز جاتی تھیں۔ صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے اور بس اڈے پر اس وقت بھی رونق تھی۔ یہیں آنے اور جانے کا عمل مسلسل جاری تھا۔ سلیم کا دوست ٹکٹیں بک کرانے گیا تھا۔

''سلیم! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' رابعہ نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ ''نہ جانے امی ابا کا کیا ردعمل ہو۔''

''کچھ بھی ہو، ہم یہاں سے جا چکے ہوں گے۔''

''سلیم مجھے ڈر ہے، کہیں دونوں گھرانوں میں جھگڑا نہ ہو۔''

''فکر مت کرو۔ دونوں طرف سے برابر کا ردعمل ہوگا۔''

''میرے بھائی بہت غصے والے ہیں۔''

''میرے بھائی بھی کم نہیں ہیں۔''

''میں جانتی ہوں..... مجھے ڈر ہے کہ بات خدانخواستہ بگڑ نہ جائے۔''

سلیم نے گہری سانس لی۔ ''اب تو ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ ہمارے کیے سے ہمارے گھر والے محفوظ رہیں۔'' سلیم بولا۔ ''لیکن ہمیں اس فیصلے تک انہوں نے ہی پہنچایا ہے۔''

سلیم کا دوست پندرہ منٹ بعد آیا۔ اس نے گوجرانوالہ جانے والی کوچ کے دو ٹکٹ لے لیے تھے۔ ''کوچ اب سے پندرہ منٹ بعد روانہ ہوگی۔ تم دونوں تیار ہو جاؤ۔''

سلیم نے سامان اٹھایا اور وہ دونوں کوچ تک آئے۔ مسافر آنا شروع ہو گئے تھے۔ ان کی سیٹیں درمیان میں تھیں۔ سامان سیٹ کر کے سلیم دوست کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ جانے سے پہلے اس نے رابعہ سے کہا۔ ''تم بیٹھو، میں پانی اور کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔''

اس وقت بس کی نصف کے قریب نشستیں بھر چکی تھیں اور تقریباً تیس بتیس افراد تھے۔ جب سلیم آیا تو ڈرائیور اپنی جگہ سنبھال چکا تھا۔ اس وقت دو تین افراد کا اور اضافہ ہوا تھا۔ رابعہ کھڑکی کی طرف والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ سلیم نے پیروں کے آگے ایک شاپر رکھا جس میں پانی کی بوتل، بسکٹ کے ڈبے اور چپس وغیرہ تھے۔ گوجرانوالہ تک تقریباً ڈھائی پونے تین گھنٹے کا سفر تھا۔ بس اپنے وقت پر روانہ ہوئی تھی۔ ایک تہائی نشستیں خالی تھیں۔ زیادہ تر مرد تھے، صرف اکا دکا عورتیں تھیں۔ رابعہ نے خود کو چادر میں چھپا رکھا تھا اگرچہ اسے بس کے لوگوں میں کوئی شناسا نظر نہیں آیا تھا پھر بھی اسے خوف تھا کہ کوئی جان پہچان والا نہ نکل آئے، اس لیے اس نے نقاب کرنے کے انداز میں چادر لے رکھی تھی۔ سلیم بھی اس حوالے سے چوکنا تھا۔ جب بس چلی تو انہوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ یہ نان اسٹاپ کوچ تھی۔

''فکر مت کرو، ہم زیادہ سے زیادہ نو بجے تک محفوظ جگہ پر ہوں گے۔''

رابعہ سوچ رہی تھی کہ کم سے کم اس کی ماں کو پتا چل گیا ہو گا۔ وہ فجر پڑھنے کے لیے اٹھتی تھی اور پھر اسے اٹھاتی تھی۔ اسے اپنے کمرے اور پھر پورے گھر میں نہ پا کر نہ جانے اس کا کیا حال ہوا ہوگا۔ رابعہ کا خیال تھا کہ ماں سب سے پہلے اس بات کو گھر سے باہر جانے سے روکے گی۔ اس کے بعد اس کا باپ اور بھائی اسے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ لازمی بات ہے کہ ان کا دھیان سب سے پہلے سلیم کی طرف جائے گا اور وہ پتا چلانے کی کوشش کریں گے۔ اور جب سلیم بھی گھر میں نہیں ملے گا تو ساری بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔ پہلے سلیم نے اسے لاہور چلنے کی تجویز دی تھی مگر رابعہ نے انکار کر دیا۔

''لاہور میں ہمارے بے شمار جاننے والے اور رشتے دار آباد ہیں۔''

پھر سلیم نے گوجرانوالہ کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرف کسی کا خیال بھی نہیں آتا۔ گوجرانوالہ میں اس کا جو دوست تھا اس کے بارے میں اس کے گھر والے بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ دوست وہاں پر ایک الیکٹرانکس آلات بنانے والی فیکٹری میں منیجر لگا ہوا تھا۔ جی ٹی روڈ پر آتے ہی ڈرائیور نے بس کو ریس دی تھی۔ صبح کے اس وقت عام ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ سلیم نے چپ بیٹھی رابعہ سے کہا۔

''کھانے کے لیے کچھ لے لو۔''

''دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

اچانک بس کی رفتار کم ہونے لگی۔ سلیم نے چونک کر سامنے دیکھا۔ کوچز اور ٹرکوں کی ایک طویل قطار نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ان کی کوچ بھی اس قطار میں لگ گئی تھی۔ رفتار رینگنے سے کچھ ہی زیادہ تھی، مسافر بھی فکرمند نظر آنے لگے تھے۔ ایک مسافر نے اٹھ کر ڈرائیور سے پوچھا۔

''یہ کیا مسئلہ ہے..... ٹریفک کیوں رک رہا ہے؟''

''آگے سڑک بن رہی ہے۔'' ڈرائیور نے بتایا۔ ''سارا ٹریفک ایک طرف سے گزر رہا ہے۔''

بس رینگ رینگ کر چلتی رہی۔ ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں کوئی پچیس منٹ لگے تھے۔ اس کے بعد بھی سڑک کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ڈرائیور بس بے فکری سے دوڑاتا۔ رفتار ساٹھ سے اوپر جاتے ہی بس کو جھٹکے لگنے لگے تھے۔ مجبوراً ڈرائیور کو رفتار کم کرنا پڑی تھی۔ سات بجے وہ آبادیوں سے نکل کر پوٹھوہار کے ویرانوں میں دوڑنے لگی تھی جس میں کہیں کہیں چھوٹے گاؤں یا جدید طرز کے مکانات تھے جو تنہائی پسند لوگوں نے جی ٹی روڈ کے ساتھ بنوا رکھے تھے۔ سورج کی روشنی پھیلنے سے اردگرد کے مناظر واضح نظر آنے لگے تھے۔ رابعہ کے لیے یہ مناظر نئے نہیں تھے۔ لاہور جاتے آتے اس نے بارہا یہ مناظر دیکھے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اور سر پیچھے کر کے بیٹھ گئی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' سلیم نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' وہ بولی۔

''ایسا کرو سو جاؤ۔'' سلیم نے مشورہ دیا۔ ''میرا خیال ہے تم رات سے جاگ رہی ہو۔''

''ایک لمحے کو بھی پلک نہیں جھپکائی تھی میں نے۔'' رابعہ آہستہ سے بولی۔ ''ایسے میں نیند کسے آتی ہے۔''

UrduMaterial.com

"بس اب سو جاؤ۔" سلیم نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔
"ہوں..... کوشش کرتی ہوں۔" رابعہ نے نرمی سے اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔

رابعہ آنکھیں بند کر کے نیم دراز تھی مگر نیند اس کی آنکھوں میں کہاں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی..... اور یہ ساری سوچیں بے ترتیب تھیں۔ کبھی اسے مستقبل کے خدشات ستاتے..... کیا انہوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ پورے ہوں گے؟ اس طرح گھر سے جانے سے اس کے گھر والوں کے کیا جذبات ہوں گے؟ نہ جانے یہ جذبات کیا رنگ دکھائیں؟ اسے اپنے بھائیوں کے غصے سے خوف آ رہا تھا، وہ سلیم کے گھر والوں سے جھگڑ پڑتے۔ خاص طور سے فضل اس معاملے میں بہت حساس تھا۔ نوبت خون خرابے کی حد تک آجاتی تو اس کی ذمے داری اس پر آتی۔ یہ سوچ کر وہ لرز گئی تھی۔

"اللہ کرے۔" اس نے بے ساختہ دل ہی دل میں کہا۔ "میرے گناہ کی سزا میرے گھر والوں کو نہ ملے۔"

دعا مانگ کر اسے اپنے الفاظ پر تعجب ہوا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس نے اس طرح گھر سے بھاگ کر گناہ کیا تھا۔ اس کا لاشعور اسے ملامت کر رہا تھا۔ جب یہ گناہ تھا تو اس نے کیوں کیا؟ شاید اس لیے کہ جب وہ یہ کرنے جا رہی تھی تو اس کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔ اب اسے اس قدم کے نتائج محسوس ہو رہے تھے۔ کیا اس کی واپسی کی راہ کھلی تھی؟ اس نے خود سے پوچھا..... جواب مایوس کن تھا۔ وہ جو قدم اٹھا چکی تھی، اس معاشرے میں اور خاص طور سے جیسا کہ اس کے گھر کا ماحول تھا یہ ناممکن ہی تھا کہ وہ اب پلٹ کر گھر واپس جا سکے۔ اسے قبول نہیں کیا جاتا۔ وہ کمان سے نکلا تیر بن چکی تھی جس کی واپسی ناممکن تھی۔ اس کا دل اندر سے کھنچنے لگا جیسے اس پر دباؤ آ رہا ہو۔ شاید اس نے جو کیا تھا یہ اس کا فطری ردعمل تھا۔ اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔ اس نے سرد آہ بھری۔

"کاش کہ میں تلافی کر سکوں۔" اس نے سوچا۔

اسی لمحے بس کی رفتار کم ہونے لگی تھی اور پھر وہ ایک جھٹکے سے رکی۔ رابعہ نے بہ مشکل خود کو سنبھالا تھا۔ بیشتر مسافروں کا ردعمل یہی تھا۔ کسی نے چلا کر کہا۔ "کیا چرس پی رکھی ہے؟" کوئی دوسرا بولا۔ "چرس پی کر بسوں کو ایکسیڈنٹ پر ایکسیڈنٹ جاتا۔ ایکسیلیٹر پر جاتا ہے۔"

"بریک کے لیے دوسری بس یا ٹرک سے کام لیا جاتا ہے۔" پہلے والے نے دوسرے کی تائید کی۔

مگر اسی لمحے بس کا آگے والا دروازہ کھلا اور دو افراد اندر آئے۔ آگے والے کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی جبکہ پیچھے والا پستول سے مسلح تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی مسافروں میں ہراس پھیل گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ڈاکو تھے اور بس لوٹنے کے لیے آئے تھے۔ شاٹ گن والے نے اس کا اعلان کیا تو ان کا رہا سہا شک بھی جاتا رہا۔ اس نے ڈرائیور کے سر پر کھڑے ہو کر کہا۔

"ہمیں صرف مال سے مطلب ہے لیکن کسی نے احمقانہ بہادری دکھانے کی کوشش کی تو جان سے بھی جائے گا۔"

دوسرا جو نسبتاً نوجوان تھا عقابی نظروں سے مسافروں کا جائزہ لیتا پیچھے کی طرف آیا۔ غالباً وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ مسافروں میں کوئی پولیس والا، کوئی سیکیورٹی گارڈ یا مسلح شخص تو بس میں موجود نہیں ہے جو ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ اس نے عقبی حصے تک دیکھا اور پھر مڑ کر شاٹ گن والے کو اشارہ کیا جو قادر بخش تھا۔ اس نے مڑ کر شاٹ گن ڈرائیور کی پشت پر رکھ دی۔ "بس موڑ کر واپس راولپنڈی کی طرف چلو۔"

"بس نے گوجرانوالہ جانا ہے۔" ڈرائیور نے منمنا کر کہا۔

"تمہیں کیا جہنم جانا ہے؟" قادر بخش دہاڑا۔ اس کے ڈیل ڈول کی طرح اس کی آواز بھی بھاری بھرکم تھی۔ "بس چلاؤ۔"

ڈرائیور نے لرزتے ہاتھوں سے بس اسٹارٹ کی اور سیدھا لے جانے لگا۔ اسے پھینچ دے کی تلاش تھی، کچھ ہی فاصلے پر پھینچ دے مل گیا تھا۔ اس نے بس گھمائی اور راولپنڈی جانے والے ٹریک پر آ گیا۔ ڈرائیور دبلا اور چھوٹے سے قد کا تھا۔ ایسا ہی کنڈیکٹر بھی تھا۔ دونوں میں ان ڈاکوؤں سے الجھنے کی ہمت نہیں تھی۔ مسافر بھی خاموش اور ساکت تھے۔ دونوں ڈاکو مستقل چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پیشہ ور ہیں اور کسی نے ذرا سی غلط حرکت کی تو اسے ہرگز نہیں بخشیں گے۔ بس ڈرائیور نے رفتار بڑھائی تھی۔

"رفتار پچاس کے قریب رکھو..... جہاں میں کہوں بس کچے میں اتار لینا۔" قادر بخش نے حکم دیا۔

ایک مسافر جس کے پاس زیادہ رقم یا کوئی قیمتی شے نہیں تھی ڈاکے میں تاخیر پر چیں بہ جبیں تھا، اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "لوٹنا ہے تو لوٹو اور جاؤ..... بس سمیت ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟"

حیات خان تیز قدموں سے اس مسافر کے پاس آیا اور اس کے سر کے اوپری حصے پر پستول کا دستہ مارا۔ اس نے چیخ ماری اور سر تھام کر اپنی سیٹ پر جھولنے لگا۔ حیات خان نے

مسافروں کی طرف دیکھا۔

"اور کسی نے پوچھنا ہے کہ ہم بس کہاں لے جا رہے ہیں؟"

سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ رابعہ نے ڈر کر سلیم کا بازو تھام لیا تھا۔ "یہ ہمیں بھی لوٹ لیں گے؟" اس نے بہت آہستہ سے کہا تھا۔

"ظاہر ہے۔" سلیم نے جواب دیا۔ اس خیال سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ دو لاکھ کے علاوہ رابعہ کا زیور بھی تھا۔ یہ سب ہاتھ سے نکل جاتا تو ان کے پاس کچھ نہ رہتا۔ رابعہ کے پوچھنے پر اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کتنی سنگین صورت حال سے دوچار تھے۔ ڈاکو تو خطرہ تھے ہی اس کے بعد پولیس انکوائری سے بھی واسطہ پڑتا اور وہ پولیس کو کیا بتاتے۔ اس خیال نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔

☆☆☆

حیات خان کا باپ ایاز خان معمولی درجے کا کسان تھا۔ معمولی سی زمین تھی جس سے اتنا مل جاتا تھا کہ بہ مشکل گزارہ ہوتا تھا۔ حیات خان کے سات بہن بھائی تھے۔ چار بہنیں تھیں جو سب حیات خان سے بڑی تھیں۔ ان کو اسکول دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا البتہ حیات خان اور اس کے دو بھائیوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ دونوں بھائی تو پرائمری کر کے ہمت ہار گئے تھے مگر حیات خان نے ضد کر کے پرائمری کے بعد بھی تعلیم جاری رکھی تھی۔ رو دھو کے اس نے میٹرک کر لیا تھا۔ اس دوران میں دونوں بھائی، باپ کی زمین سنبھال چکے تھے۔ دو سے تین بازو ہوئے تو انہوں نے کچھ زمین ٹھیکے پر حاصل کر لی۔ سردیوں میں وہ گندم لگاتے تھے اور گرمیوں میں سبزی..... اس سے حالات بہتر ہوئے تھے مگر اسے خوش حالی نہیں کہا جا سکتا تھا پھر بھائیوں کی شادیاں ہوئیں۔ بیویاں آئیں۔ ہر سال بچے جننے لگیں تو آنے والی خوش حالی کی سی چھاؤں پھر سے غربت کی کڑی دھوپ میں بدل گئی۔

حیات خان اکیلا تھا۔ ماں باپ کے گزرنے کے بعد وہ اور اکیلا ہو گیا تھا کیونکہ بھائیوں اور بھابیوں نے نظریں بدل لی تھیں۔ ان کو ابھی سے یہ فکر ستانے لگی تھی کہ حیات خان نے بھی شادی کر لی تو اتنی سی زمین تین خاندانوں کا بوجھ کیسے برداشت کرے گی۔ حالانکہ حیات خان دونوں بھائیوں سے زیادہ محنت کرتا تھا۔ وہ تھا بھی مضبوط اور حوصلے والا۔ اس نے بھائیوں سے کہہ کر ساتھ والی زمین جو ایک ٹیلے کی صورت میں تھی، اسے معمولی سی رقم کے بدلے پٹے پر لے کر اس پر سفیدے کے درخت لگا دیے تھے۔ اس کی کافی مانگ تھی۔ دو سال بعد ان کو یکمشت اچھی خاصی رقم مل جاتی۔

حیات خان تعلیم یافتہ تھا۔ مسائل کے حل کے بارے میں سوچتا تھا صرف حال کے ہی نہیں مستقبل کے مسائل کے بارے میں بھی۔ وہ پچیس برس کا ہونے والا تھا اور جلد یا کسی قدر تاخیر سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ درخت فروخت کر کے اتنی رقم حاصل کر لی جائے جس سے چار پانچ ایکڑ زمین پٹے پر مل جائے اور بوائی کے اخراجات بھی پورے ہو جائیں۔ اس زمین پر وہ سبزی لگاتا۔ سبزی سے زیادہ آمدنی حاصل ہوتی تھی اور خرچا بھی زیادہ نہیں تھا۔ بس محنت عام فصلوں سے زیادہ کرنی پڑتی تھی تو وہ اس کا بھی عادی تھا۔

حیات خان یہ ساری تگ و دو بلاوجہ نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کی امیدوں کا مرکز اس کے رشتے کے تایا کی لڑکی شہ بانو تھی..... اسے شہ بانو پسند تھی اور اسے معلوم تھا کہ شہ بانو بھی اسے پسند کرتی ہے۔ وہ اس سے سات برس چھوٹی تھی۔ تایا کے گھر والوں کو بھی اس کی پسند کا اندازہ تھا اور ان کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ اعتراض حیات کی بھابیوں کو تھا۔ وہ حیات خان کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں، ورنہ شاید بہت پہلے اس کی شادی ہو جاتی۔ اس کے ساتھ کے تمام لڑکے اب شادی شدہ اور کئی بچوں کے باپ تھے۔ حیات خان اپنے اور اپنے بھائیوں کے لیے قربانی دے رہا تھا۔ جوانی کے یہ دن اکیلے گزار رہا تھا۔ صبح سے شام تک زمین پر خون پسینا ایک کرتا تھا اور رات کو روکھی سوکھی کھا کر سو جاتا۔ اسے انتظار تھا کہ کب درخت لگتے ہیں اور کب وہ زمین لیتا ہے۔

مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ اس کے بھائیوں نے..... محنت سے سینچے ہوئے درختوں کا اس سے پوچھے بغیر سودا کر دیا، وہ بھی اونے پونے۔ یہی نہیں بلکہ اسے اس کا حصہ بھی نہیں دیا۔ جب اس نے بھائیوں سے پوچھا تو انہوں نے اس کا حصہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ "تیرے کون سے بیوی بچے ہیں..... کلم کلا ہے۔ تجھے پیسے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں ابھی اکیلا ہوں..... کل کو میری شادی ہو گی۔" اس نے کہا۔ "میں نے اتنی محنت اس لیے کی تھی؟ نیچے کنوئیں میں پانی بھر کر اوپر درختوں کو سینچا تھا۔ تم لوگوں نے کیا کیا۔"

"ہم نے پٹے کے پیسے دیے تھے۔" منجھلے بھائی نے غم ٹھونک کر کہا۔

"زمین کی آمدنی میں میرا برابر کا حصہ ہے۔ اگرچہ میں تم دونوں سے زیادہ محنت کرتا ہوں، تم وہ بھی نہیں دیتے.....

UrduMotor.com

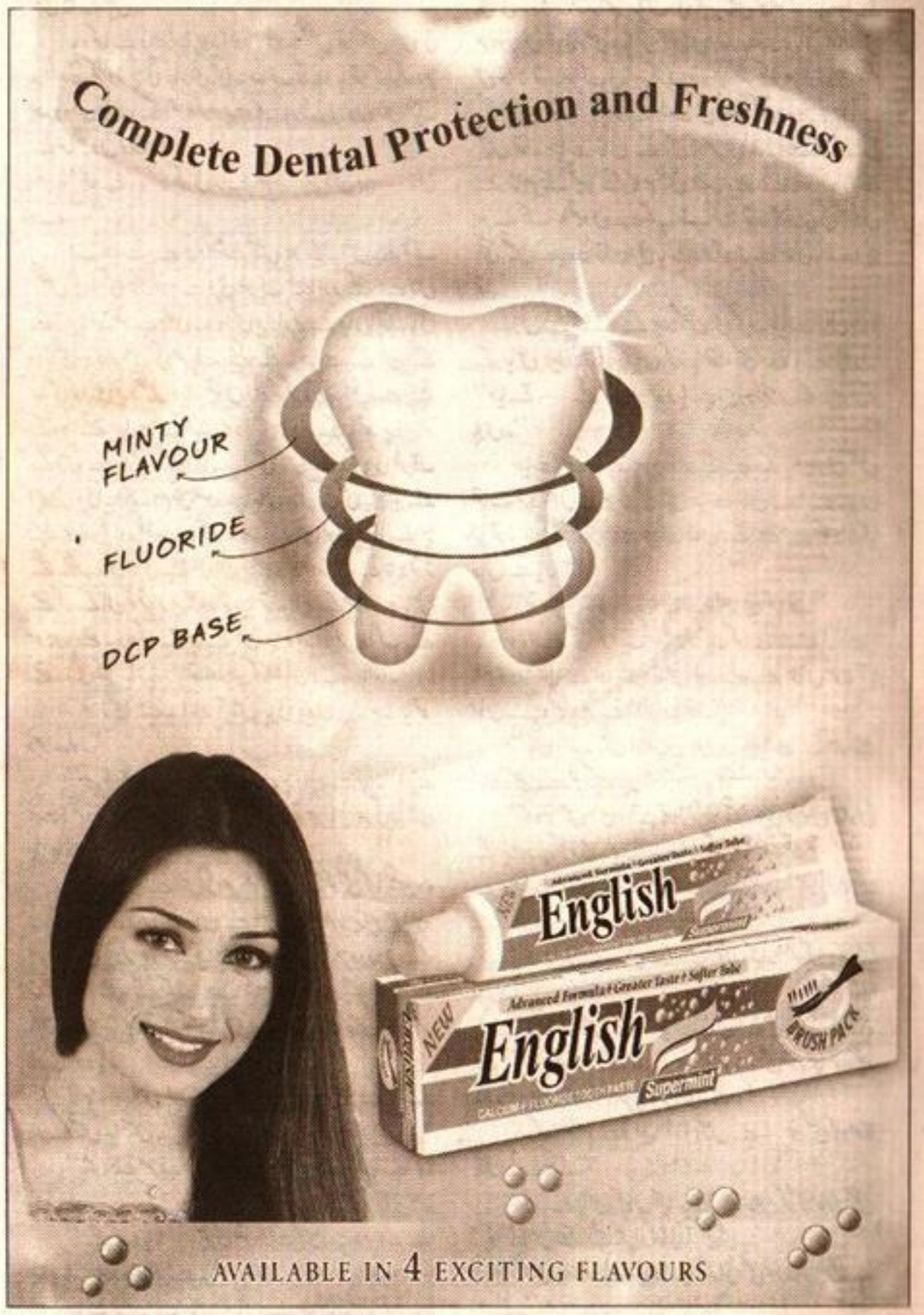

لیکن ان درختوں کی آمدنی مجھے دو۔ میں نے اور زمین لینی ہے۔''

مگر بھائیوں نے رقم نہ دی۔ انہوں نے دینی ہوتی تو یہ حرکت ہی کیوں کرتے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ رقم تو خرچ ہو چکی ہے۔ حیات خان کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے بھائی اس کی پیٹھ میں یوں چھرا گھونپ سکتے ہیں۔ انہوں نے اس کے ساتھ ہی نہیں اپنے ساتھ بھی برا کیا تھا۔ حیات خان نے ان کے لیے ترقی کرنے کا ایک موقع پیدا کیا تھا اس نے برابر والی زمین کے مالک سے پٹے پر دینے کی بات بھی کرلی تھی۔ اس کا سارا منصوبہ سارے خواب بکھر گئے تھے مگر اصل دھچکا ابھی باقی تھا۔ وہ ہفتے میں ایک آدھ بار تایا کے گھر جاتا تھا۔ اس بار گیا تو تایا نے رکھائی سے بات کی اور تائی نے اس سے صاف کہہ دیا۔

''حیاتے..... اب ادھر نہ آیا کر..... تو نے شہ بانو کے لیے جو سوچا ہے وہ نہیں ہوسکتا۔''

حیات خان دم بہ خود رہ گیا تھا۔ ''کیا کہہ رہی ہے تائی؟''

''جو کہہ رہی ہوں سن لیا..... اب باقی جا کر اپنے گھر والوں سے پوچھ۔''

حیات خان نے آکر بھائی بھابیوں سے پوچھا۔ پہلے تو انہوں نے ٹالا مگر جب اس نے سختی سے پوچھا تو اس کی بڑی بھابی نے تنک کر کہہ دیا۔ ''ہاں..... اگر جہیز میں دو ایکڑ زمین مانگ لی تو کیا برا کیا؟''

''جہیز میں زمین کون دیتا ہے۔'' حیات خان نے بپھر کر کہا۔ ''تم جہیز میں کتنی زمین لائی تھیں۔''

''میری بات نہ کر۔''

''کیوں، تم آسمان سے آئی ہو؟'' حیات خان نے کہا۔

جھگڑا بڑھا۔ بیویوں کے شور مچانے پر بھائی اس پر پل پڑے تھے۔ حیات خان نے کبھی بڑے بھائیوں کو جواب دینے کا نہیں سوچا تھا۔ وہ خاموشی سے پٹتا رہا۔ بھائیوں نے اسے مار کر گھر سے نکال دیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے انہوں نے حیات خان سے کہا کہ اب اس کا ان سے، اس گھر سے اور زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

''تم لوگ مجھ سے تعلق ختم کر سکتے ہو..... لیکن اس گھر اور اس زمین سے میرا تعلق ختم نہیں کر سکتے۔''

یہ رات حیات خان نے ایک دوست کے گھر گزاری۔ جسم اور دل کے زخموں سے بے پروا وہ بھائیوں کے رویے کی وجہ سوچتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ پہلے سے طے شدہ منصوبہ تھا اور اس قسم کا منصوبہ بنانا اس کے بھائیوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ واضح طور پر بھابیوں نے یہ پٹی پڑھائی تھی اور بھائیوں نے اس پر عمل کیا تھا۔ ان کا مقصد اسے گھر اور زمین سے بے دخل کرنا تھا۔ حیات خان سوچتا رہا اور اپنے بھائیوں کی تنگ ذہنیت پر کڑھتا رہا جنہوں نے اپنا مضبوط ہاتھ خود کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ اگلے روز جب وہ اپنا ذاتی سامان لینے گیا تو اس نے بھائیوں سے کہا۔

''تم نے معمولی سی زمین اور اس کچے مکان کے پیچھے خون کے رشتے کو کاٹ دیا مگر زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تم جان جاؤ گے۔ سونا زمین نہیں اگلتی ہے، یہ ہاتھ ہیں جو اس سے سونا اگلواتے ہیں۔ یہ زمین اور یہ گھر تمہیں مبارک ہو۔ تم اس سے مجھے محروم کر سکتے ہو، میرے مقدر کے رزق سے نہیں۔''

حیات خان کے بھائی شرمندہ نظر آنے لگے اور اس کی بھابیوں کو اپنا منصوبہ خطرے میں نظر آنے لگا۔ انہوں نے اس پر چڑھائی کردی۔ ''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے بھابیو..... تم نے جو سوچا تھا اس میں کامیاب رہیں۔ اب بھائی مجھے واپس بھی بلائیں تو میں نہیں آؤں گا۔ اب زمین بھائیوں کی ہے اور مجھے امید ہے کہ تم لوگوں کے تمام ارمان پورے ہوجائیں گے۔'' اس کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔

''زیادہ مکاریاں مت دکھا۔'' بڑی بھابی نے کہا۔ ''اگر زمین چھوڑ رہا ہے تو کچے کاغذ پر لکھ کر دے۔''

''میں اپنی ذمے داری چھوڑ رہا ہوں۔ اپنا حصہ نہیں..... دونوں محنت کرو اور گزارہ کر کے دکھاؤ۔''

حیات خان نے محنت مزدوری شروع کردی۔ وہ کام کرنے والا بندہ تھا اور ایسا آدمی کبھی بے روزگار نہیں رہتا۔ زمینوں پر کام کر کے اسے معاوضہ کم ملتا تھا لہٰذا جی ٹی روڈ کے ساتھ تعمیر ہونے والے مکانات اور دوسری عمارات میں مزدوری بھی کرنے لگا۔

ایک روز وہ کام کر رہا تھا۔ یہ بنگلہ تھا جو ایک مقامی رئیس بنوا رہا تھا۔ اچانک اسے بنگلے کے باہر شور سنائی دیا۔ وہ باہر آیا۔ تین افراد مل کر ایک شخص کو مار رہے تھے۔ وہ جی داری سے مقابلہ کر رہا تھا مگر اس کے مقابل تین تھے اور لاٹھیوں سے مسلح تھے جبکہ وہ خالی ہاتھ تھا۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے اس شخص کو لہولہان کردیا تھا۔ وہ اتنی بے دردی سے لاٹھیاں برسا رہے تھے کہ لگتا تھا اسے مار ڈالیں گے۔ حیات خان نے انہیں للکارا۔

''اوئے..... بے شرمو..... ایک کو تین مارتے ہو۔''

''چپ کر۔'' ایک خوں خوار لہجے میں بولا۔ ''ورنہ تجھے

بھی بتاتے ہیں۔"

مار کھانے والا لمبا چوڑا اور مضبوط شخص تھا لیکن اس کی مدافعت کمزور پڑتی جارہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ ان تینوں کے رحم وکرم پر ہوگا۔ مارنے والوں میں ایک نے ساتھیوں کو للکارا۔

"اوئے..... دیکھ کی رئے ہو..... سر بھن دو..... ماں دے....."

اب حیات سے برداشت نہیں ہو سکا۔ اس نے ایک شخص کی لاٹھی پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور گھٹنے سے اس کے زیر ناف ضرب لگائی۔ وہ زخمی پردار کرنے جارہا تھا۔ باقی دو لاٹھی بردار اس کی طرف لپکے تھے۔ حیات نے ان کے ساتھی کو انہی پر دھکیل دیا۔ تینوں الجھ کر گرے۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتے حیات نے ایک اور لاٹھی بردار کے ہاتھ پر وار کر کے اس سے لاٹھی چھین لی۔ یہ لاٹھی اس نے زخمی کی طرف اچھال دی۔ ایک دم ہی صورت حال بدل گئی تھی۔ چند لمحے پہلے جو فاتح اور غضب ناک تھے، اب ان کو اپنے لالے پڑ گئے تھے۔ زخمی لاٹھی ملتے ہی ان پر جھپٹا تھا اور اس نے تابڑ توڑ حملے کر کے ان کو فرار پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کے گھوڑے پاس موجود تھے۔ وہ گرتے پڑتے ان پر سوار ہو کر بھاگ نکلے تھے۔ زخمی کھڑا ہانپ رہا تھا اور ان کو گالیاں دے رہا تھا۔

"تو زخمی ہے۔ اندر آ میں پاتی دوں..... منہ ہاتھ دھولے۔"

"میری فکر نہ کر۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "ایسے بہت زخم دیکھے ہیں۔ ہاں، پانی پلا دے تو مہربانی ہوگی۔ میں چلا جاؤں گا۔"

حیات خان نے اس کی مرہم پٹی کرنے کو بھی کہا لیکن وہ نہ مانا۔ اس نے حیات خان سے اس کا نام اور پتا پوچھا اور صرف پانی پی کر چلا گیا۔ حیات خان دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام میں لگ گیا۔ جب شام کو ٹھیکیدار آیا اور اسے جھگڑے کا پتا چلا تو اس نے اسی وقت حیات خان کو بلا کر فارغ کر دیا۔

"جا..... کہیں اور کام دیکھ..... ہمیں جھگڑنے والے بندے نہیں چاہئیں۔"

"میں نے صرف اس کی مدد....." حیات خان نے کہنا چاہا۔

"تجھے کہہ دیا نا، تیری ضرورت نہیں ہے یہاں۔ اپنا حساب اور جا ادھر سے۔"

حیات خان چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔ ان دنوں وہ جی ٹی روڈ کے ساتھ سڑک کی تعمیر میں کام کرنے والے مزدوروں کی عارضی رہائش گاہ میں رہ رہا تھا۔ وہاں کھانا بھی مل جاتا تھا۔ سڑک کی تعمیر کرانے والا کنٹریکٹر مزدوروں کو کم تنخواہ دیتا تھا..... پر رقم یکمشت مل جاتی تھی، روز کا حساب نہیں تھا۔ حیات خان نے بھی ادھر ہی ملازمت کر لی۔ صبح سے شام تک تعمیر کے کام میں حصہ لینے کے بعد وہ رات سونے تک ساتھیوں سے گپ شپ کرتا تھا۔ گانوں کی محفلیں سجتی تھیں۔ حیات خان اپنی پاٹ دار آواز سے سماں باندھ دیتا تھا۔

اس روز کھانے کے بعد محفل جمی تھی۔ حیات خان الاؤ کے پاس بیٹھا خوش گپیاں کر رہا تھا، کسی نے اسے پکارا۔

"حیاتے..... تجھے کوئی پوچھ رہا ہے، سپروائزر کے خیمے کے پاس۔"

حیات اٹھ کر آیا۔ سپروائزر کے خیمے کے پاس وہی شخص تھا۔ پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں حیات خان نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ گرم جوشی سے حیات خان کے سینے سے لگا۔ "کیا حال ہے یارا؟"

"تو سنا..... اس روز نام بتائے بغیر چلا گیا تھا۔"

وہ اسے کھینچ کر ایک نسبتاً تاریک گوشے تک لایا۔ "میرا نام قادر بخش ہے اور میں خاص طور سے تجھے تلاش کرتا آیا ہوں۔ تجھے ٹھیکیدار نے نکال دیا تھا۔"

"ہاں، اب میں ادھر ہی ہوں۔" حیات نے جواب دیا۔ "تیرے زخم کیسے ہیں؟"

"وہ تو میں اسی وقت بھول گیا تھا۔ اپنی زندگی زخموں کے سہارے گزری ہے۔"

حیات خان نے اسے غور سے دیکھا۔ "تو کرتا کیا ہے؟"

"ڈاکو ہوں۔" اس نے بے جھجک کہا۔ "لوگوں کو لوٹتا ہوں۔"

"تجھے ڈر نہیں لگا۔" حیات خان نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر کہا۔ "مجھے بتاتے ہوئے..... ابھی شور مچا کر تجھے پکڑوا دوں تو.....؟ ادھر پولیس بھی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تو ایسا آدمی نہیں ہے..... تو کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"میرے پاس کیوں آیا ہے؟" یہ جان کر کہ قادر بخش ڈاکو ہے اس کے لہجے میں رکھائی آگئی تھی۔

"اس روز تو نے جی داری دکھائی تھی ورنہ وہ مجھے مار ڈالتے۔"

"وہ کون تھے؟"

"دشمن تھے..... موقع مل گیا تھا..... مجھے گھیر لیا۔ رب کو زندگی منظور تھی، تجھے بھیج دیا۔"

"اسے بھول جا..... میں نے خاص تیرے لیے نہیں کیا تھا۔ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔"

"تجھے شکریہ کہنے نہیں آیا ہوں۔" قادر بخش بولا۔ "میں تجھے اپنے ساتھ شامل کرنے آیا ہوں۔"

"میں تیرے ساتھ....." حیات خان بوکھلا گیا۔

"ہاں، میں اکیلا کام کرتا ہوں..... آج کل بندے کا خود کا اعتبار نہیں ہے کسی دوسرے پر کیا اعتبار کرے..... پر اکیلے کام کرنا بھی دشوار ہے۔ میں چاہتا ہوں تو میرے ساتھ....."

"اوئے میں تجھے ڈاکو نظر آتا ہوں۔" حیات خان بھڑک گیا۔ "تو نے کیا سوچ کر یہ بات کی ہے؟"

"غصہ نہ کر..... اس پر اچھی طرح سوچ لے۔ یہ سو ڈیڑھ سو کی مزدوری کر کے کیا کمار ہا ہے۔ اپنی جوانی برباد کر رہا ہے۔"

"اپنی جوانی برباد کر رہا ہوں..... کسی کو لوٹ تو نہیں رہا۔" اس نے طنز کیا۔

"میں بھی کسی کو ناجائز نہیں لوٹتا..... ادھر سڑک پر سفر کرنے والوں سے مہینے میں دو تین بار پانچ دس ہزار لے لیتا ہوں۔ آرام سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

"جب تیری آرام سے گزر بسر ہو جاتی ہے تو مجھے کیوں شامل کرنا چاہ رہا ہے؟"

"میں نے بتایا نا اب اکیلے کام کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ ایک مہینے پہلے میں نے ایک کار روکی، اس میں دو عورتیں بھی تھیں۔ میں نے ان پر توجہ نہیں دی۔ مرد کو لوٹتا رہا۔ اچانک ایک عورت نے پستول نکال کر مجھ پر فائر کر دیا۔ بال بال بچا تھا۔"

"مجھے شامل کرے گا تو آمدنی کم نہیں ہو جائے گی تیری؟"

"نہیں..... دو بندے بڑا شکار کر سکتے ہیں اگر تو ہاں....."

"قادر بخش اس بات کو بھول جا..... اب مجھ سے ملنے بھی مت آنا۔" حیات خان نے اس کی بات کاٹی۔ "بس میں اتنا کر سکتا ہوں کہ تیرے بارے میں پولیس کو نہ بتاؤں۔"

"حیات خان، میں ایک مہینے بعد پھر آؤں گا۔" قادر بخش بولا۔ "اس وقت بھی تیرا یہی جواب ہوا تو پھر کبھی نہیں آؤں گا۔"

"تو مت آنا اس وقت بھی، میرا جواب یہی ہوگا۔" حیات خان نے یقین سے کہا تھا۔

"میں پھر بھی آؤں گا۔" قادر بخش اس کے سینے سے لگا۔ "رب راکھا۔"

قادر بخش تاریکی میں غائب ہوا تو حیات خان بھی تھکے قدموں سے لوٹ آیا۔ اسے یہ جان کر دھچکا لگا تھا کہ قادر بخش ڈاکو تھا۔ نہ جانے کیوں قادر بخش اسے ایک بار میں ہی اچھا لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ جی داری سے تین مسلح افراد کا مقابلہ کر رہا تھا۔ لہولہان ہو جانے کے باوجود اس نے ہار نہیں مانی تھی۔ حیات خان مزدوری میں لگا رہا۔ اس کی تنخواہ تین ہزار طے ہوئی تھی جبکہ خود کام کر کے وہ اس سے زیادہ ہی کما لیا کرتا تھا اور مہینے میں دس گیارہ چھٹیاں بھی مل جاتی تھیں۔ یہاں اتوار کے دن بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ صبح نو بجے سے شام کو اس وقت تک کام ہوتا تھا جب تک سورج غروب نہیں ہو جاتا تھا۔ پندرہ دن بعد مہینا مکمل ہو گیا۔ حیات خان مزدوری لینے گیا۔ کنٹریکٹر کا منیجر جو تنخواہیں تقسیم کرتا تھا، اس نے پہلے تین ہزار کی رسید پر حیات خان کے دستخط کرائے اور پھر اسے تنخواہ دی۔ حیات خان نے رقم گنی۔ یہ ستائیس سو روپے تھے۔

"تین سو روپے کم ہیں۔" اس نے منیجر سے کہا۔

"ٹھیک ہیں۔ سب کو تین سو روپے کم ملیں گے۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" حیات نے احتجاج کیا۔ "رسید تو تین ہزار کی ہے۔"

"زیادہ نہ بول..... یہ ادھر کا اصول ہے۔ دس فیصد سہولتوں کے کٹتے ہیں۔ خیمے ملے ہیں..... پینے کا پانی ملتا ہے۔"

"تو رسید بھی ستائیس سو کی بناؤ۔" حیات خان نے بے باکی سے کہا۔ "باقی کے بتاؤ کہ کیوں کاٹتے ہو؟"

اس بار منیجر نے اسے خوں خوار نظروں سے دیکھا۔ "لگتا ہے تو ادھر سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔"

"بے شک فارغ کر دو پر تنخواہ اتنی لوں گا جتنی طے ہوئی تھی۔"

"تو اس طرح نہیں سمجھے گا۔" منیجر نے کہا اور اپنے خاص آدمیوں کو آواز دی۔ "سلطان..... منورے ادھر آؤ..... ذرا اسے سمجھاؤ۔"

سلطان اور منور بدمعاش تھے۔ ان کو خاص طور سے اس لیے رکھا گیا تھا کہ مزدوروں میں کوئی اکڑ دکھائے تو یہ اس کی

UrduPhoto.com

اکڑ نکال دیں۔ منیجر کے پکارنے پر دونوں اندر آئے اور حیات کو دھکے دے کر خیمے سے باہر لے آئے۔ حیات خان نے مزاحمت کی کوشش کی تو انہوں نے اسے بے دریغ مارنا شروع کر دیا۔ وہ پیشہ ور بدمعاش تھے، حیات ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا، اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ حیات کے ساتھی مزدور دیکھ رہے تھے لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ مداخلت کرے۔ جب تک حیات کے پیروں میں دم رہا، وہ ان کے سامنے ڈٹا رہا پھر گرا تو سر پر لگنے والی ایک ٹھوکر کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ اسے ہوش خیمے میں آیا جہاں وہ چار دوسرے مزدوروں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اس کے ساتھیوں نے مرہم پٹی کی، اسے زبردستی ہلدی ملا دودھ پلایا اور ڈانٹتے رہے کہ اسے منیجر کے منہ لگنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کمینہ آدمی ہے مزدوروں سے اسی طرح زبردستی اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ مزاحمت کرنے والے کو فارغ کر دیتا ہے اور جو زیادہ مزاحمت کرے اس کا حشر حیات جیسا ہوتا تھا۔

رات میں سلطان اور منورا سے خیمہ بستی سے نکالنے کے لیے آگئے تھے۔ منیجر نے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ حیات کے ساتھی مزدوروں نے منت سماجت کر کے ایک رات کی مہلت لی تھی کہ وہ صبح چلا جائے گا مگر اگلے روز بھی اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ساتھی اسے جانے نہیں دے رہے تھے لیکن وہ خود ضد کر کے وہاں سے چلا آیا۔ خوش قسمتی سے اس کی تنخواہ محفوظ رہی تھی ورنہ ان بدمعاشوں سے کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اس سے رقم بھی چھین لیتے۔ حیات نے ذرا فاصلے پر ایک جھونپڑی ہوٹل میں چارپائی کرائے پر لی۔ دو دن تک وہ وہیں آرام کرتا رہا۔ اس کا ارادہ تھا کہ صحت یاب ہونے پر راولپنڈی چلا جائے گا اور وہیں پر مزدوری کرے گا۔ تیسرے دن تک اس کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ اس نے ایک نیا جوڑا لیا تھا۔ نزدیک کنوئیں پر نہا کر اس نے کپڑے بدلے اور ناشتا کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ روانگی کا تھا۔

اچانک کوئی اس کے سامنے آ بیٹھا۔ حیات خان نے آنکھیں اوپر کیں اور قادر بخش کو دیکھ کر بولا۔ ”تو.....!“

”ہاں میں..... میں نے تیرے بارے میں سنا ہے۔“

”کیا سنا ہے؟“ حیات نے اشارے سے ہوٹل کے لڑکے کو مزید ناشتا لانے کو کہا۔

”سنا ہے تجھے مارا ہے اور ملازمت سے نکال دیا۔“

”ہاں۔“ حیات خان تلخی سے بولا۔ ”میری تنخواہ کم دے رہا تھا۔ میں نے شور کیا تو اپنے آدمیوں سے مجھے پٹوایا اور ملازمت سے بھی نکال دیا۔“

”اور تو خاموشی سے چلا آیا۔“ قادر بخش غصے سے بولا۔

”اس روز میرے پاس تو مرنے مارنے کو تیار تھا۔“

”وہ اور بات تھی۔ میں بدمعاش تھوڑی ہوں جو ان سے لڑتا۔“

”چل میرے ساتھ۔“

حیات نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں راولپنڈی جا رہا ہوں، اب ادھر ہی محنت مزدوری کروں گا۔“

”چلے جانا..... پنڈی بھی چلے جانا..... پر ادھر ایک دو دن میرے ساتھ رہ۔“

ہر چند کہ حیات نے انکار کیا لیکن قادر بخش اس طرح سر ہوا، اس کے لہجے میں اتنی اپنائیت تھی کہ حیات کو ماننے ہی بن پڑی تھی۔ قادر بخش اتنی عجلت میں تھا کہ اس نے ناشتا کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ کباب پراٹھے پیک کروا لیے تھے۔ وہ گھوڑے پر تھا اور اس نے حیات کو بھی پیچھے بٹھا لیا۔ ذرا دیر بعد گھوڑا جی ٹی روڈ پر دوڑا جا رہا تھا۔

”تو کہاں رہتا ہے؟“ حیات نے پوچھا۔

”ابھی دیکھ لینا۔“ قادر بخش نے گھوڑے کی رفتار بڑھائی۔ ”سنبھل کر بیٹھنا۔“

ذرا دیر میں اس نے گھوڑا روڈ سے جنگل کی طرف موڑ دیا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد وہ درختوں سے گھرے کچے احاطے میں تھے جس کے وسط میں ایک کچا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ ایک طرف کنواں تھا۔ اس روز گرمی شدت کی تھی۔ ان کو کچی جھونپڑی کے خنک سائے میں آ کر ہی چین ملا تھا۔ قادر بخش اس کے لیے نمک والی لسی لے آیا تھا۔ وہاں کھانا بنانے کا سامان تھا اور ساتھ میں دودھ دہی بھی۔

”تو یہاں رہتا ہے؟“ حیات نے تانبے کا بڑا سا گلاس خالی کرتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا ہی سمجھ لے۔ ویسے میرے کئی ٹھکانے ہیں۔ میں کہیں بھی رہ جاتا ہوں۔“ وہ بولا اور چولہا جلانے لگا۔

”کھانا تم خود بناتے ہو؟“

”ظاہر ہے۔ میں نے کہا نا میں کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا اور کوئی کام کرنے والا کہاں ملے گا۔“

”یعنی گھر والی بھی نہیں ہے؟“

وہ ہنسا۔ ”ہم جیسے لوگ گھر والی کا نہیں سوچ سکتے۔“

”پھر کیوں کرتا ہے ایسے کام؟“

”کچھ اور آتا ہی نہیں ہے۔ پندرہ سال سے یہی کام کر رہا ہوں۔ بس لالچ نہیں کرتا، چھوٹے موٹے پر گزارہ کر لیتا ہوں۔“

”جوان مضبوط آدمی ہو..... محنت مزدوری بھی کر سکتے ہو۔“

”تو نے کر کے دیکھ لی..... کیا ملا تجھے؟“ اس نے تلخی سے کہا۔

”تبھی میں شہر جا رہا ہوں۔“

”شہر میں اس سے بھی بڑے بیٹھے ہیں، وہ تیرا خون نچوڑ کر پی جائیں گے۔ جب پندرہ بیس سال بعد تجھ میں کچھ باقی نہیں رہے گا تو تجھے خالی پھوک کی طرح پھینک دیں گے۔“

”تو مجھے اس کام پر آمادہ نہیں کر سکتا۔“ حیات نے نفی میں سر ہلایا۔

قادر بخش نے بھیڑ کا ابال کر اور نمک لگا کر سکھایا ہوا گوشت نکالا اور آلو کے ساتھ اس کا سالن بنانے لگا۔ اس نے تو ابھی رکھا تھا۔ وہ روٹیاں بھی خود ڈال لیا کرتا تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم میں اس نے کھانا تیار کر لیا تھا اور حیرت انگیز طور پر وہ مزے کا تھا۔ حیات نے پورا ناشتا کیا تھا اس کے باوجود اس نے ڈٹ کر کھایا۔ ساتھ ہی لیموں کا اچار اور لسی بھی تھی۔ قادر بخش ارد گرد کے چرواہوں سے دودھ لے آتا تھا۔ کھا پی کر وہ باہر نیم کے بڑے سے درخت تلے بچھی چارپائیوں پر آ لیٹے۔

”لگتا ہے تجھے بہت مارا ہے۔“ قادر بخش نے اس کے زخم دیکھے۔

”ہاں، بے دردی سے مارا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا ہاتھ نہ اٹھ سکا۔ ورنہ میں کمزور نہیں ہوں..... بس بچاؤ ہی کرتا رہا تھا۔“ حیات بولا۔

”کیا خیال ہے..... بدلہ لے گا؟“

حیات چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”آج شام چلنا میرے ساتھ..... مطلب بھی سمجھ جائے گا۔“

شام کو قادر بخش نے پھر روٹیاں ڈالیں۔ بچا ہوا سالن ان کے ساتھ کھایا پھر دونوں نکل گئے۔ حیات کا خیال تھا کہ وہ اسے شاید مزدوروں کے کیمپ کی طرف لے جا رہا ہے مگر وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا اس سے آگے نکل گیا۔ اس کا رخ ذرا فاصلے پر آباد امرا کی ایک چھوٹی سی بستی کی طرف تھا۔ اس علاقے میں چھوٹی بڑی کوئی درجن بھر کوٹھیاں تھیں۔

”تیرا مہربان ادھر ہی رہتا ہے۔“ قادر بخش نے گھوڑا ایک چھوٹی سی کوٹھی کے سامنے روک دیا۔ ”یہ ٹھکانا عیاشی کے لیے بنایا ہے۔ وہ بھی ادھر رہتا ہے۔“

”کون..... کس کی بات کر رہا ہے؟“

”ٹھیکیدار کا منیجر قربان شاہ..... وہ ادھر ہی رہتا ہے۔ آ، میرے ساتھ۔“

قادر بخش نے گھوڑا کوٹھی کی عقبی چار دیواری کے ساتھ کھڑا کیا اور اس پر چڑھ کر اندر کود گیا۔

”آ جا۔“ اس نے دبی آواز میں حیات سے کہا تو وہ بھی بادل ناخواستہ اندر آ گیا تھا۔

”قادر، یہ کیا کر رہا ہے؟“

”دیکھتا رہ۔“ قادر بخش نے عمارت کا رخ کیا۔ اس کے پاس شاٹ گن تھی۔

اتفاق سے ایک عقبی دروازہ کھلا تھا اور اندر کمرے کے فرش پر نوکر سو رہا تھا۔ قادر بخش نے اسے جگایا تو دو ڈھائی پوشوں کو دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی تھی۔ اس نے بلا چون وچرا اپنے ہاتھ پاؤں بندھوا لیے۔ قادر نے کپڑا ٹھونس کر اس کا منہ بھی بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کے بتائے ہوئے کمرے کی طرف بڑھے جس میں قربان تھا۔ قادر نے زور سے دروازہ بجایا۔

”کیا ہے؟“ اندر سے قربان کی نیند میں ڈوبی آواز آئی لیکن قادر نے جواب دینے کے بجائے دروازہ بجانا جاری رکھا۔ حتیٰ کہ قربان نے جھنجلا کر دروازہ کھول دیا اور وہ دونوں اندر گھس گئے۔ بستر میں ایک نوجوان اور نیم عریاں عورت بھی تھی۔ اس نے خود کو جلدی سے چادر میں چھپا لیا۔

”خبردار..... کسی کے حلق سے آواز نہ نکلے۔“ قادر بخش غرایا۔

مسلح ڈاکو دیکھ کر قربان کی گھگی بندھ گئی تھی۔

”کک..... کیا چاہتے ہو؟“

قادر بخش ہنسا۔ ”ہمیں دیکھ کر بھی پوچھ رہے ہو۔ سنا ہے تو نے مزدوروں کا خون نچوڑ کر جمع کر رکھا ہے۔ وہ خون لینے آئے ہیں..... سود کے ساتھ۔“

”میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

اسے دیکھ کر حیات خان کا خون کھولنے لگا تھا۔ اس نے اسے کتنی بے دردی سے پٹوایا تھا اور پھر ملازمت سے بھی نکلوا دیا۔ وہ اچانک ہی قربان پر ٹوٹ پڑا اور اسے بے دریغ مارنے لگا۔ قربان قالین پر گرا چلا رہا تھا اور چادر میں چھپی عورت کے حلق سے بھی ڈری ڈری چیخیں نکل رہی تھیں۔ قادر

UrduPhoto.com

بخش سکون سے تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دور موجود گھروں تک آواز نہیں جائے گی۔ حیات نے قربان کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس دوران قادر بخش نے الماری کی تلاشی لے کر اندر سے پندرہ ہزار کی رقم برآمد کی تھی، دو ہزار قربان کے بٹوے سے نکلے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھ سے سونے کی موٹی سی انگوٹھی بھی اتار لی تھی جس میں قیمتی پتھر لگا تھا۔ عورت کی طرف اس نے توجہ نہیں دی تھی جو ڈر رہی تھی کہ اب اس کی باری آئے گی۔

''چلو۔'' قادر بخش نے حیات سے کہا اور وہ کمرا باہر سے بند کر کے نکل آئے۔ جاتے ہوئے قادر بخش نے نوکر کو بندھی رسی ڈھیلی کر دی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد وہ کھول سکتا تھا۔ وہ آرام سے وہاں سے نکل آئے اور نصف رات سے پہلے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ حیات خان دو دن اس کے ساتھ رہا تھا۔ اس دوران میں قادر بخش نے اسے اسلحے کا استعمال اور گھڑ سواری کی تربیت دی تھی۔ تیسرے دن اس نے چلے جانا تھا۔ اس نے پہلے ہی قادر بخش سے کہہ دیا تھا لیکن جب وہ صبح اٹھے تو حیات نے اس سے کہا۔ ''یار! میں تیرے ساتھ شامل نہیں ہو سکتا؟''

قادر بخش کھل اٹھا تھا۔ ''کیوں نہیں..... یہ تو میری خواہش ہے۔''

اس بات کو پانچ برس ہو چکے تھے۔ شروع میں ایک سال حیات خان، قادر بخش کے ساتھ رہا تھا پھر اس نے اپنے گاؤں کے نزدیک ایک جگہ چار ایکڑ زمین لے لی تھی۔ ایک سال میں اتنی رقم ہو گئی تھی کہ اس نے زمین لے لی۔ اس پر کچا مکان بنایا اور اس میں رہنے لگا۔ زمین کی حالت اچھی نہیں تھی۔ زمین کٹاؤ کا شکار تھی۔ شروع میں اس نے محنت کی تھی اس سے ملا ملایا کچھ نہیں تھا۔ پھر حیات خان کی محنت رنگ لائی اور اس سال زمین پر اس نے گندم کی بوائی کی تھی، اسے اتفاق سے اچھی نسل کی دیسی گندم کا بیج ملا تھا۔ اس کی بازار میں اچھی قیمت مل جاتی تھی۔ حیات خان نے دو بھینسیں اور چند بکریاں بھی پال لی تھیں، ان کی دیکھ بھال اور دودھ فروخت کرنے کے لیے ایک ملازم رکھ لیا تھا۔ جب حیات خان، قادر بخش کے بلاوے پر جاتا تھا تو ملازم گھر اور زمین کو بھی دیکھتا تھا۔ ان چار سالوں میں حیات خان کے پاس خاصی رقم جمع ہو گئی تھی اور وہ مزید زمین لے سکتا تھا۔

پروگرام طے کرنے کے لیے وہ مہینے میں ایک بار ملتے تھے، کبھی قادر بخش کے پاس پروگرام طے ہوتا تھا اور کبھی وہ دونوں مل کر فیصلہ کرتے تھے۔ جیسے اس بار قادر بخش نے پہلے سے طے کر لیا تھا۔ قادر بخش نے بچپن سے سوائے محرومیوں کے اور کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس کا باپ جہلم کے پاس ایک گاؤں کا رہنے والا تھا..... جواری اور نکما۔ اس کی ماں کو چھ بچوں کا تحفہ دے کر ایک روز وہ ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کا کوئی اتا پتا نہیں ملا تھا۔ اکیلی عورت چھ بچوں کی پرورش کرتے کرتے بے حال ہو گئی تھی۔ وہ خوب صورت اور جوان تھی اس لیے علاقے کے کئی بااثر افراد اس پر للچائی نظر رکھتے تھے لیکن اس کی خوش قسمتی کہ اس کی برادری مضبوط تھی اس لیے وہ محفوظ رہی۔ اس نے چھ بچوں کو پالنے کے لیے ہر ممکن محنت کی تھی حتیٰ کہ کھیتوں میں مزدوروں کی طرح کام بھی کیا تھا۔

قادر بخش چوتھے نمبر پر تھا، اس سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ وہ بن باپ کے ڈرے سہمے بچے تھے لیکن قادر بخش بچپن سے نڈر اور چھین جھپٹ کرنے والا لڑکا تھا اسی وجہ سے محلے سے سب سے زیادہ شکایتیں اسی کی آتی تھیں اور وہی ماں سے سب سے زیادہ پٹتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اور بھی ضدی اور بے باک ہو گیا تھا۔ محلے کے بچوں سے ان کی چیزیں چھین لینا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے بچپن سے اس کے اندر جرم کے جراثیم تھے۔ اس نے پہلی باقاعدہ چوری کی تھی۔ وہ گاؤں کے نمبردار کے گھر میں گھسا تھا اور ایک ہزار روپے اڑا لایا تھا لیکن پکڑا گیا۔ اس نے بے دریغ یہ رقم خرچ کی تھی۔ اس پر شک کی بنا پر جب پولیس نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اسے قبول کرنا پڑا تھا۔ اسے ایک سال کی سزا ہوئی تھی مگر نو مہینے بعد ہی وہ رہا ہو گیا تھا۔ اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں جو کمی رہ گئی تھی وہ اس نو مہینے میں پوری ہو گئی۔

دو تین سال وہ دوسروں کے ساتھ رہا تھا۔ ابھی اس میں اکیلے جرم کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ماں نے اسے گھر سے اور گاؤں والوں نے گاؤں سے نکال دیا تھا۔ ایک بار پولیس چھاپے میں اس کے سارے ہی ساتھی پکڑے گئے تھے۔ وہ واحد بچا تھا اور گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ پوٹھوہار کے اندرونی علاقے کی طرف بھاگا تھا، تب سے وہ یہیں تھا۔ اس نے کچھ اصول اپنا لیے تھے جن کی وجہ سے وہ دوبارہ گرفتاری سے بچا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسی واردات کرتا جس میں زحمت زیادہ نہ ہو۔ وہ زیادہ لالچ نہیں کرتا تھا اور جب تک پہلی واردات کا جمع جتھا خاتمے کے قریب نہیں پہنچ جاتا تھا، وہ دوسری واردات نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے ٹھکانے ہمیشہ بدلتا رہتا تھا۔ دیر ان علاقوں میں اس نے اپنے دو تین ٹھکانے بنا لیے تھے۔ ان میں رہتا تھا اور لوگوں سے کم ملتا تھا۔ بیس سال سے اس نے کسی آبادی میں گھر نہیں بنایا تھا۔

چار پانچ سال پہلے اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اب اسے کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے جتنا سخت جان نہیں رہا تھا۔ خاص طور سے جب سے کار میں سوار عورت نے اس پر فائر کیا تھا اور وہ بال بال بچا تھا، تب سے وہ اکیلا واردات کرتے ہوئے ڈرنے لگا تھا۔ اسے شدت سے ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے کچھ دشمن بھی بن گئے تھے۔ وہ بھی ڈاکو تھے اور انہیں اس علاقے میں قادر بخش کی سرگرمیاں پسند نہیں تھیں۔ موقع پا کر ایک دن انہوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اگر حیات خان نہ آیا ہوتا تو وہ اسے شاید مار ہی ڈالتے۔ اسے حیات سے مل کر لگا جیسے یہی وہ شخص ہے جس کی اسے تلاش تھی۔

قادر بخش کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ وہ کب تک جرم کرتا رہے گا۔ چند سال بعد اس کا جسم جواب دے جائے گا۔ تب وہ کیا کرے گا۔ اس نے کوئی جمع جتھا بھی نہیں کیا تھا۔ کوئی ساتھی ہوتا تو وہ بڑی واردات کر سکتا تھا، زیادہ حاصل کر سکتا تھا اور مستقبل کے لیے بچا سکتا تھا۔ پھر جب حیات نے اس کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی تو اس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ حیات کے آنے سے اس کے اعتماد میں اضافہ ہوا تھا۔ قادر بخش عام طور سے جی ٹی روڈ سے گزرنے والے اکا دکا افراد کا انتخاب کرتا تھا کیونکہ لٹنے والے بیشتر افراد رپورٹ نہیں کراتے تھے اور جو کراتے تھے پولیس عام طور سے ان پر کارروائی نہیں کرتی تھی۔ ہر واردات کے بعد قادر بخش اپنے ٹھکانے سے کئی ہفتے تک باہر نہیں نکلتا تھا۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ پولیس کی سرگرمیاں ختم ہو گئی ہیں تب ہی باہر آتا تھا۔

حیات خان کے شامل ہونے کے بعد اس نے نسبتاً بڑی وارداتیں شروع کر دیں۔ وہ وین اور کوچز لوٹنے لگا تھا۔ اس سے آمدنی بڑھی تھی۔ جو ملتا، اخراجات کے بعد وہ اسے جمع کر لیا کرتا تھا۔ ایک سال بعد جب حیات خان نے زمین خریدنے کا ارادہ کیا تو اس نے جمع شدہ ساری رقم اس کے حوالے کر دی تھی۔ حیات خان نے زمین لے کر اسے آباد کرنا شروع کر دیا۔ قادر بخش کو اس کی خوشی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ کچھ اور رقم ہو جائے تو وہ بھی زمین لے لے گا۔ یہ دھندا ترک کر دے گا پھر اپنا گھر بسائے گا۔ پچھلے تین سالوں میں اس نے اچھی خاصی رقم جمع کر لی تھی۔ جب سے حیات الگ ہوا تھا وہ موقع پر رقم کے دو حصے کر لیا کرتے تھے۔

قادر بخش کے پاس پانچ لاکھ روپے تھے۔ ان سے اس نے شاہ کوٹ نامی گاؤں کے پاس زمین لے لی تھی۔ یہ کل بارہ ایکڑ زمین تھی۔ اس کے ساتھ اسے ایک چھوٹا سا مکان بھی ملا تھا مگر اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ اس زمین کو آباد کر سکتا، اس لیے وہ انتظار کر رہا تھا۔ حیات کی باتوں سے بھی اسے لگ رہا تھا کہ اب وہ اس کام کو چھوڑنا چاہتا تھا۔ شاید وقت آ گیا تھا کہ وہ جرم اور گناہ کی اس دنیا سے نکل جائے۔

☆☆☆

ڈرائیور نے گاڑی بلا چون وچرا اس کچے راستے پر اتار لی جس کی طرف قادر بخش نے اشارہ کیا تھا۔ سوال کرنے والے مسافر کا حشر دیکھ کر سب خاموش تھے۔ کوئی پانچ چھ سو گز کے بعد آگے راستہ بند نظر آنے لگا۔ کم سے کم بس اس راستے سے نہیں گزر سکتی تھی۔ ڈرائیور نے بے بسی سے قادر بخش کی طرف دیکھا۔ ''بس آگے نہیں جا سکتی۔''

''اسے ان درختوں کے پیچھے لے چلو۔'' قادر بخش نے بائیں طرف چند اونچے اور گھنے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ مقصد یہی تھا کہ بس ہائی وے سے نظر نہ آئے۔ راستہ تنگ اور ناہموار تھا لیکن ڈرائیور کسی نہ کسی طرح بس درختوں کے عقب میں لے آیا تھا۔ اگر سورج پوری آب وتاب سے نہ چمک رہا ہوتا تو اس جگہ دن میں بھی نیم تاریکی ہوتی۔ جیسے ہی ڈرائیور نے بس روکی قادر بخش نے اگنیشن سے چابی نکال لی۔ اس نے مسافروں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔

''ایک ایک کر کے آگے آؤ۔ خبردار، کسی نے کوئی شے چھپانے کی کوشش کی۔ تم سب سے پہلے آؤ۔''

قادر بخش نے سامنے بیٹھے شخص سے کہا۔ وہ لرزتے قدموں سے اٹھ کر سامنے آیا۔ قادر بخش نے کنڈیکٹر کو حکم دیا۔ ''اس کی تلاشی لے کر سب نکال لو۔ کچھ چھوڑا تو تیری شامت آئے گی۔''

کنڈیکٹر مجبور تھا۔ اس نے مسافر کی جیب سے سب نکال لیا۔ مسافر کے پرس میں چار پانچ سو روپے تھے۔ قادر بخش نے سو روپے چھوڑ کر باقی لے لیے۔ دوسری چیزیں بھی اسے واپس کر دی تھیں۔ وہ غریب سا آدمی تھا۔ اس کے بعد والے کے پاس سے ساڑھے تین ہزار نکلے تھے۔ اس کے ہاتھ میں اچھی گھڑی اور سونے کی انگوٹھی تھی۔ قادر بخش نے دونوں چیزیں لے لیں۔ اس نے ایک درمیانے سائز کا چرمی بیگ بس کے ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اس میں رقم اور دوسری اشیا ڈال رہا تھا۔ مسافر ایک ایک کر کے آ رہے تھے اور اپنی رقم اور دوسری اشیا سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔ عقبی

حصے میں حیات خان ٹہلتے ہوئے مسافروں پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ ان میں سے کوئی کسی شے کو چھپانے کی کوشش نہ کرے۔

سلیم اور رابعہ مسافروں میں سب سے زیادہ فکرمند تھے۔ ان کے پاس نقدی بھی تھی اور بھاری مالیت کے زیورات بھی۔ اگر جسمانی تلاشی کے بعد ڈاکو سامان کی تلاشی بھی لیتے تو وہ اپنے اثاثوں سے محروم ہو جاتے۔ رابعہ نے محسوس کیا کہ سلیم اس سے بار بار کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن رک جاتا ہے۔ شاید اسے خوف تھا کہ نزدیک ہی موجود دوسرا ڈاکو نہ سن لے۔ مسافروں کی تلاشی اور ان کو جمع پونجی سے محروم کرنے کا عمل آگے سے شروع ہوا تھا اور بہ تدریج پیچھے کے مسافروں کی باری آرہی تھی۔ سلیم سے آگے بیٹھے فرد نے اٹھ کر تلاشی دی اور لٹا پٹا واپس آکر اپنی نشست پر ڈھیر ہو گیا۔ قادر بخش نے سلیم کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

''سنا نہیں تو نے۔'' قادر بخش گرجا۔

حیات خان نے سلیم کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور آگے دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا اور پھر سست قدموں سے کنڈیکٹر کی طرف بڑھا۔ اس نے ہاتھ آگے کر کے سلیم کا لباس ٹٹولا۔ بٹوا قمیص کی پہلو والی جیب میں تھا۔ اس نے بٹوا نکال لیا۔ سلیم کی گھڑی راڈو کی تھی۔ قادر بخش کے اشارے پر کنڈیکٹر نے گھڑی بھی اتار لی۔ سلیم کے بٹوے میں بائیس سو کی رقم تھی۔ حسب معمول قادر بخش نے سو روپے چھوڑ کر باقی رقم نکال لی۔ کنڈیکٹر مشینی سے انداز میں سلیم کے جسم کے پہلوؤں میں ہاتھ مار رہا تھا۔ اس نے بائیں طرف ہاتھ مارا تو ایک لمحے کو وہ رکا، اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی۔ سلیم نے اسے آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ کنڈیکٹر کے ہاتھ پھر سے حرکت میں آئے۔ اس نے قادر بخش سے کہا۔

''بس جی اس کے پاس یہی تھا۔''

قادر بخش نے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کے بعد بیٹھے شخص کو آگے آنے کا اشارہ کیا تھا۔ ایک گھنٹے میں سارے آدمیوں کی تلاشی لی جا چکی تھی اور صرف تین عورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ حیات خان نے ان تینوں سے پرس مانگے جو کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد مل گئے تھے۔ ان کی تلاشی لے کر اس میں سے بھی رقم اپنے پاس رکھ لی اور پرس واپس کر دیے تھے۔ قادر بخش دل ہی دل میں رقم کا حساب بھی کرتا جا رہا تھا۔ تقریباً چالیس کے قریب افراد ہے۔ یہ مشکل ستر پچھتر ہزار روپے ملے تھے۔ یہ خاصی مایوس کن رقم تھی، وہ تو لاکھ سے اوپر کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے کنڈیکٹر سے کہا۔

''اوئے لوگوں کا سامان نیچے اتار۔''

یہ سن کر مسافر احتجاج کرنے لگے تھے۔ ''ہمارے پاس..... اب کچھ نہیں ہے۔'' ایک مسافر نے کہا۔

''کپڑے اور سامان تو چھوڑ دو۔'' دوسرے مسافر نے بھی احتجاج کیا۔

''خاموش!'' قادر بخش گرجا اور شاٹ گن کا رخ مسافروں کی طرف کر دیا۔ ''اب کسی کی آواز نکلی تو حلق سے گولی گزار دوں گا۔''

شاٹ گن کے سامنے سب چپ ہو گئے تھے مگر ان کے چہروں پر احتجاج نمایاں تھا۔ قادر بخش نے کنڈیکٹر سے کہا۔

''تو منہ کیا دیکھ رہا ہے..... کام کر۔''

مجبوراً کنڈیکٹر حرکت میں آیا۔ اس نے اوپر لگے ریک سے سامان اتارنا شروع کیا۔ یہ جدید طرز کی بس تھی جس میں اوپر لگے ریک میں چھوٹا سامان اور سوٹ کیس رکھنے کی گنجائش تھی۔ البتہ بڑا سامان اور چیزیں بس کے نچلے حصے یا چھت پر رکھا جاتا تھا۔ اوپری خانے میں رکھا سامان برائے نام تھا۔ زیادہ تر چھوٹا سامان تھا جو ریک میں تھا۔

سلیم اور رابعہ کے چہرے سفید ہو رہے تھے۔ ان کی کُل پونجی ان کیسوں میں تھی جو اوپر ریک میں رکھے تھے۔ کنڈیکٹر سامان اتار اتار کر بس کے اگلے دروازے کے سامنے زمین پر ڈھیر کرتا جا رہا تھا۔ قادر بخش اس کی نگرانی کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اسے دھمکاتا جا رہا تھا کہ وہ چالاکی دکھانے یا بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔

''سلیم..... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' رابعہ نے آہستہ سے کہا۔

''ڈاکو ہیں..... ان سے یہی توقع کی جا سکتی ہے۔'' وہ بھی آہستہ سے لیکن تلخی کے ساتھ بولا۔

''یہ سب لے گئے تو ہم کیا کریں گے؟''

''شش۔'' سلیم نے کہا۔ ''ابھی ان کو پتا نہیں ہے۔''

''کیا بات کر رہے ہو؟'' حیات خان ان کے نزدیک ...آیا تھا۔

''کچھ نہیں، میری بیوی اپنے سامان کے لیے پریشان ہے۔'' سلیم بولا۔

''فکر مت کرو، ہمیں کسی کے ذاتی سامان سے غرض نہیں ہے۔'' حیات خان نے اس سے کہا۔ ''تلاشی کے بعد تمہارا سامان واپس مل جائے گا۔ بس اس میں رقم اور کوئی قیمتی شے ہے، تو وہ نہیں ہو گی۔''

سلیم اور رابعہ اسی لیے تو پریشان تھے۔ کنڈیکٹر نے ان کے سوٹ کیس اٹھائے تو رابعہ کا دل رک سا گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سب کا سامان نیچے پہنچا دیا تھا پھر خانے سے

بھی نکالا اور اوپر رکھے بھاری سوٹ کیسز بھی نیچے اتار دیے تھے۔ اس موقع پر قادر بخش خود بھی کنڈیکٹر کے ساتھ اتر گیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کنڈیکٹر موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نہ جائے۔ البتہ حیات خان بس میں تھا اور پوری طرح چوکنا تھا۔

قادر بخش نے سارا سامان اتروا کر کنڈیکٹر کو اوپر جانے کا حکم دیا۔ اس کے اندر جاتے ہی حیات خان نیچے اتر آیا تھا۔ چابی قادر بخش کے پاس تھی، اسے اعتماد تھا کہ ڈرائیور بس نہیں لے جا سکتا تھا۔ یہ اے سی کوچ تھی جس میں کھڑکیاں فکس ہوتی ہیں، صرف اوپر ایک چھوٹا سا کھلنے والا خانہ ہوتا ہے جس سے کوئی آدمی باہر نہیں نکل سکتا۔ نکاسی کے دونوں دروازے سامنے تھے اور ان دونوں کی نظروں میں آئے بغیر کوئی بس سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

''حیاتے..... سامان چیک کر..... جلدی۔'' قادر بخش نے اس سے کہا۔ ''بس اب نکلنا ہے۔''

اس وقت دس بج رہے تھے۔ سورج پوری طرح بلند ہو چکا تھا اور ہوا میں ہلکی سی تمازت آ گئی تھی۔ اگرچہ یہ جگہ سڑک سے دور..... ویران اور چھپی ہوئی تھی اس کے باوجود ان کو خدشہ تھا کہ کوئی آ نہ جائے۔ حیات خان نے سوٹ کیس اور بیگ کھول کھول کر دیکھنا شروع کر دیے۔ اس کے پاس ایک فولادی آلہ تھا جس سے وہ ان کے تالے توڑ رہا تھا۔

☆☆☆

رابعہ اور سلیم اتفاق سے کھڑکی کے سامنے تھے جہاں سے ان ڈاکوؤں کی کارروائی واضح نظر آ رہی تھی۔ ان کا سامان خاصا نیچے دبا ہوا تھا مگر جلد یا بہ دیر ڈاکو اسے کھول لیتے۔ زیورات کے ڈبے تو سامنے تھے لیکن رقم سلیم کے بیگ میں نیچے دبی تھی۔ سلیم بے حد مضطرب تھا جبکہ رابعہ حسرت سے سامان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک سلیم نے اس سے کہا۔ ''سنو..... میں برداشت نہیں کر سکتا..... یہ اتنی آسانی سے ہمیں نہیں لوٹ سکتے۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' رابعہ مایوسی سے بولی۔

''میرے پاس پستول ہے..... میں ان کو فائر کر کے بھگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ سنو ہمیں اپنے بیگ لے کر بھاگنا ہوگا۔'' سلیم سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔

''تمہارے پاس پستول کہاں ہے؟'' رابعہ نے پریشان ہو کر کہا۔

''میرے پاس ہے۔''

''نہیں..... پلیز تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔''

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ڈاکو ہیں، گولی چلاتے ہوئے ذرا نہیں ہچکچاتے۔''

''رابو..... میں اپنی اور تمہاری پونجی لٹتے نہیں دیکھ سکتا۔'' سلیم نے کُرتے کے نیچے سے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر مت کرو۔''

''پاگل ہو گئے ہو تم!'' رابعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چپ کرو..... تم مرواؤ گی مجھے۔'' سلیم نے برہمی سے کہا اور جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ ''جیسے ہی میں کہوں اٹھ کر آ جانا۔''

''ہم کہاں جائیں گے؟''

''یہاں سے نکلنا ہے۔'' سلیم بس والوں کے سامنے زیادہ بات کرنے سے گریز کر رہا تھا جو بہ غور ان کی باتیں سن رہے تھے۔

''بھائی صاحب کیا بات ہے؟'' ایک نستعلیق قسم کے نوجوان نے پوچھا اور جب سلیم نے پستول نکالا تو اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ ''ایک اور ڈاکو.....''

''چپ کر کے بیٹھو۔'' سلیم نے غرا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

ڈرائیور نے دروازہ بند نہیں کیا تھا، اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ رابعہ حیران پریشان سلیم کو جاتا دیکھ رہی تھی۔ سلیم دروازے کے پاس جا کر رکا تھا پھر اس نے اچانک دروازے کے سامنے آتے ہوئے ڈاکوؤں کی طرف فائر کیے۔ اس نے لگاتار تین گولیاں چلائی تھیں۔ رابعہ نے ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دونوں ڈاکو درختوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ سلیم نے دروازے سے باہر نکل کر ان پر ایک فائر اور کیا تھا۔ رابعہ نے نسبتاً نوجوان ڈاکو کو قلابازیاں کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ اس کا ساتھی اسے سہارا دے کر اور پھر اٹھا کر درختوں کے پیچھے لے گیا تھا۔

''سلیم!'' رابعہ چلائی اور اٹھ کر بھاگی تھی۔ وہ دروازے کی سیڑھی سے گرتے گرتے بچی تھی۔ سلیم نے اسے سنبھالا تھا۔

''آرام سے..... رابعہ، اپنا بیگ اٹھاؤ۔''

سلیم اور رابعہ نے پاگلوں کی طرح سامان سے اپنے بیگ تلاش کیے۔ سلیم بار بار درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے قادر بخش اور حیات خان گئے تھے۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ وہاں سے فائر نہ کر دیں۔ بیگ ملتے ہی وہ لوگ دوسری طرف بھاگے تھے۔

درختوں کے عقب میں قادر بخش حیات خان کو سنبھال

رہا تھا اس کا جسم نزع کے عالم میں جھٹکے لے رہا تھا۔ گولی عقب سے عین دل والی جگہ لگی تھی۔ حیات خان کے لبوں سے خون پھوٹ نکلا تھا۔

''حیاتے!'' قادر بخش نے وحشت سے کہا۔

''قادر..... اللہ..... مجھے..... معاف۔'' حیات کہتے کہتے رک گیا تھا۔ تکلیف کی وجہ سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''حیاتے..... میری جان!'' قادر نے اسے نرمی سے سیدھا کیا۔ ''نہ بول۔''

پھر قادر نے درختوں کے دوسری طرف سے کسی کے چلانے کی آواز سنی تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ ایک مرد اور ایک عورت دوسری طرف بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے گولی چلانے والے کو نہیں دیکھا مگر مرد کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ گولی اسی نے چلائی تھی۔ جتنی دیر میں وہ شاٹ گن سیدھی کرتا وہ دونوں درختوں میں غائب ہو چکے تھے۔ اس نے پلٹ کر حیات خان کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ چند لمحے کا مہمان ہے۔ قادر بخش کے اندر اشتعال کی لہر اٹھی تھی۔ اس نے پلٹ کر حیات کے پاس پڑا پستول اٹھایا اور ان درختوں کی طرف لپکا جس میں وہ مرد اور عورت غائب ہوئے تھے۔ قادر بخش ان سے بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھا۔ بھاگتے ہوئے بھی اس کی انگلی شاٹ گن کے ٹریگر پر تھی۔

سلیم ہر ممکن تیزی سے بھاگ رہا تھا اور رابعہ اس کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلیم نے اس کا ہاتھ نہ تھام رکھا ہوتا تو وہ خاصی پیچھے رہ جاتی۔ دو تین بار وہ گری تھی۔ سلیم اسے بار بار تیز چلنے کو کہہ رہا تھا لیکن اس نے رابعہ سے اس کا بیگ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بیگ کے بوجھ کے ساتھ بھاگنا دشوار ہو رہا تھا۔

''مم..... مجھ..... سے..... نہیں بھاگا..... جا رہا۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ہمارا سڑک..... تک جانا لازمی ہے۔'' سلیم بولا۔ ''اس علاقے سے جلدی نہ نکلے تو پولیس کے چکر میں پڑ سکتے ہیں۔''

رابعہ سمجھتی تھی، پولیس کے چکر میں پڑنے کا مطلب تھا کہ وہ پکڑے جاتے۔ عین ممکن تھا اس کے باپ اور بھائی تھانے میں رپورٹ کروا دیں۔ وہ بار بار مڑ کر بھی دیکھ رہی تھی۔ درختوں سے نکل کر وہ جھاڑیوں سے بھری ایک ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ ایک بار رابعہ کو کسی کی جھلک نظر آئی تھی۔

''سلیم کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔''

سلیم نے اس لیے ڈھلان کا راستہ اختیار کیا تھا کہ بلندی سے سڑک واضح نظر آتی۔ وہ اس ڈھلان کے ساتھ ساتھ سڑک تک جا سکتے تھے۔ رابعہ کی بات سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر اسے سرمئی رنگ کی جھلک نظر آئی۔ شاٹ گن والے ڈاکو نے سرمئی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

''رابعہ! یہ ڈاکو ہے..... ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔'' سلیم نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

وہ تیزی سے اوپر کی طرف بھاگے۔ اس بار سلیم نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور سہارے کے لیے جھاڑیاں پکڑ پکڑ کر اوپر جا رہا تھا۔ رابعہ اس کی تقلید کر رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کی رفتار کم تھی اور وہ سلیم سے دور ہوتی جا رہی تھی سلیم اسے جلدی چلنے کو کہہ رہا تھا پر اس نے اپنی رفتار میں کوئی کمی آنے نہیں دی تھی۔ رابعہ چند منٹ میں خاصی پیچھے رہ گئی تھی۔ سلیم ڈھلان کے اوپری حصے میں پہنچ گیا تھا اور اچانک ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ شاید وہ رابعہ کا انتظار کیے بغیر ہی دوسری طرف اترنے لگا تھا۔

رابعہ کا ذرا سی دیر میں برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی ایسی بھاگ دوڑ نہیں کی تھی اور وہ اس قسم کے راستوں کی عادی بھی نہیں تھی۔ جب وہ اوپر پہنچی تب بھی اسے سلیم کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ البتہ بائیں طرف درختوں کا بلند و بالا جھنڈ تھا۔ رابعہ کو خیال آیا، شاید سلیم پناہ کے لیے اس طرف چلا گیا ہے۔ وہ بھی اترنے لگی۔ اس طرف جھاڑیاں سخت اور گھنی تھیں۔ پہلے اس کی چادر الجھی اور اس طرح الجھی کہ اسے اتارنی پڑی تھی۔ پھر اس کا سوٹ کیس ایک جگہ پھنسا۔ اس نے اسے بھی چھوڑ دیا اور خالی ہاتھ درختوں کی طرف بھاگی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ڈاکو اسے اور سلیم کو مارنے کے لیے ان کے پیچھے آ رہا ہے، اس کے ہاتھ آئے تو وہ بے دریغ مار دے گا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہانپتی کانپتی درختوں تک پہنچی اور اس نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ اسے ڈاکو ڈھلان کے بلند حصے پر نظر آیا تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک ایک فائر ہوا اور رابعہ نے ڈاکو کو اپنا بایاں بازو تھامتے دیکھا، وہ خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ اس پر سلیم نے فائر کیا تھا۔ خود سلیم کہاں تھا؟ رابعہ کو نظر نہیں آ رہا تھا مگر ڈاکو نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے سلیم پر شاٹ گن سے فائر کیا۔ رابعہ نے چیخ سنی پھر اس نے سلیم کو نشیبی حصے میں گرتے دیکھا اس کا

بے جان اور خون سے تر جسم لڑھک رہا تھا۔ رابعہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی تھی۔ ڈاکو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کی طرف آنے لگا۔ رابعہ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں اور دکھ کی شدت سے دل جیسے رک گیا تھا، اس کے باوجود وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ ڈاکو کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے درختوں کے عقب کی طرف جھانکا، اس طرف کوئی بلند ٹیلا تھا۔ اپنی سسکیاں روکتے اور آنسو صاف کرتے ہوئے وہ اس طرف جاگی۔

ٹیلے پر اسے شکستہ چار دیواری نظر آئی۔ دیوار محض پتھروں کا ڈھیر تھی۔ وہ دیوار کے پاس پہنچی تو اسے اندر مسجد کی محراب نظر آئی۔ یہ خانہ خدا تھا بلکہ اب بھی ہے۔ کیا ہوا جو شکستہ اور ویران تھا۔ رابعہ اس کے اندر داخل ہوئی۔ محراب بھی شکستہ تھی لیکن ابھی تک قائم تھی۔ رابعہ سسکیاں لیتی محراب میں داخل ہوئی اور لڑکھڑا کر گر گئی۔

''یا اللہ..... یہ کیا ہو گیا..... یہ کیا ہو گیا..... میرے گناہ معاف کر دے..... میرے اللہ۔'' وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔ شدتِ غم سے اس پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ آخری خیال اس کے اندر یہی آیا تھا۔ ''کاش یہ سب غلط ہو..... سب ٹھیک ہو جائے۔''

☆☆☆

اچانک رابعہ کو جھٹکا لگا تھا اور اس نے خود کو بس کی سیٹ پر بیٹھے پایا۔ بس پوری رفتار سے جی ٹی روڈ پر دوڑی جا رہی تھی۔ رابعہ نے پلکیں جھپکائیں۔ اپنے پاس بیٹھے سلیم کو دیکھا پھر بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم ٹھیک ہو؟''

سلیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''ہاں..... مجھے کیا ہوا ہے؟''

''تو وہ سب خواب تھا۔'' رابعہ نے گہری سانس لی..... سکون اور شکر سے بھری۔ ''اللہ کا شکر ہے، وہ سب ایک خواب تھا..... حقیقت نہیں۔''

اسی لمحے بس کی رفتار کم ہونے لگی تھی اور پھر وہ ایک جھٹکے سے رکی۔ رابعہ نے بروقت اگلی سیٹ کی پشت تھام کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ کئی مسافروں نے بلند آواز سے بسم اللہ کہا اور کئی ایک نے اس آفت کی وجہ پوچھی۔ وجہ بھی جلد سامنے آ گئی۔ بس رکتے ہی ڈرائیور نے اندر سے لیور کھینچ کر اس کا دروازہ کھول دیا اور دو افراد اندر آ گئے، وہ مسلح تھے۔ رابعہ نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا تھا۔ وہ خود سے بولی۔ ''یہ تو وہی ہیں..... یہ تو وہی ہیں۔''

''کون وہی ہیں؟'' سلیم نے پوچھا۔

''وہی ہیں۔'' رابعہ بولی۔ ''میرے اللہ! تو کیا وہ خواب نہیں تھا؟''

☆☆☆

سلیم نے الجھی نظروں سے رابعہ کی طرف دیکھا۔ وہ بس میں آنے والوں کے لیے اعلان کر رہی تھی کہ یہ وہی ہیں۔ اس نے رابعہ کو ہلایا۔ ''کیا کہہ رہی ہو..... کون سا خواب؟''

رابعہ گھبرائی ہوئی تھی۔ ''سلیم وہ خواب نہیں تھا۔ یہ ڈاکو ہیں، تمہیں مار دیں گے۔ خدا کے لیے ان سے مت الجھنا۔''

سلیم نے مسلح افراد کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''تم فکر مت کرو..... میں پاگل نہیں ہوں۔''

''یہ ہمارا سامان لوٹ کر لے جائیں گے۔ ان کو مت روکنا..... انہیں لے جانے دینا۔'' رابعہ سسکیاں لینے لگی تھی۔ ''ورنہ یہ تمہیں مار ڈالیں گے۔''

''میرے خدا!'' سلیم سچ مچ پریشان ہو گیا تھا۔ اسے دو لاکھ روپے اور رابعہ کے زیورات کا خیال تو آیا ہی نہیں تھا۔ ڈاکو یہ لوٹ کر لے جاتے تو ان کے پاس کیا باقی بچتا۔

''یہ ابھی بس کو سڑک سے اتار کر کچے میں لے جائیں گے۔ وہاں اطمینان سے مسافروں کو لوٹیں گے۔'' رابعہ نے کہا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' سلیم حیرت سے بولا۔

''میں یہ سب.....'' رابعہ بتاتے بتاتے رک گئی۔ وہ ڈاکو پاس آ گیا تھا جسے سلیم نے گولی ماری تھی۔

''سب چپ ہو جائیں۔'' اس نے خاص طور سے رابعہ اور سلیم کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔ ''کسی نے زبان کھولی تو اسے بند کرنا پڑے گا۔'' اس نے پستول لہرایا تھا۔

تمام مسافر خاموش ہو گئے تھے رابعہ یاد کرنے لگی، کیا اس ڈاکو نے پہلے یہ دھمکی دی تھی؟ اگر نہیں تو اس کا مطلب تھا، سب پہلے کی طرح نہیں ہو رہا تھا۔ تو کیا وہ بھی بچ جائیں گے؟ اس نے سلیم کا ہاتھ تھام لیا تھا اور آنکھوں میں اس سے التجا کی تھی کہ وہ خاموش رہے اور ان لوگوں سے الجھے نہیں۔ سلیم نے بھی اسے نگاہوں میں تسلی دی تھی۔ اچانک ڈرائیور نے بس راولپنڈی جانے والے ٹریک پر موڑ دی۔ رابعہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا اور تقریباً ڈیڑھ دو کلو میٹر کے بعد بس کچے پر اتر گئی تھی۔ یہ بھی پہلے جیسا تھا لیکن کسی مسافر نے سوال کرنے اور نو جوان ڈاکو کی طرف سے اس کا سر پھاڑنے کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ بس مخصوص راستے سے گزر رہی تھی۔ رابعہ نے سب دیکھا بھالا تھا۔

''ابھی یہ بس لے جا کر درختوں کے درمیان روکے گا۔'' وہ حکم کے باوجود خاموش نہ رہ سکی۔

''تم کو کیسے پتا؟'' سلیم نے کہنا چاہا۔

''اوئے تجھے چپ رہنے کو نہیں بولا۔'' نو جوان ڈاکو نے درشت لہجے میں کہا۔ اس دوران میں ڈرائیور دوسرے ڈاکو کی ہدایت کے مطابق بس کو درختوں کے درمیان لے جا رہا تھا۔ جیسے ہی بس رکی اور انجن بند ہوا اس نے چابی قبضے میں لے کر اپنے ساتھی سے کہا۔

''کیا بات ہے؟''

''یہ کچھ زیادہ ہی بول رہا ہے۔'' نو جوان ڈاکو نے سلیم کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا..... ذرا سامنے تو لا اسے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

''چل اوئے۔'' نو جوان ڈاکو نے سلیم کی قمیص کا کالر پکڑ کر کھینچا۔ اس کا کرتہ ایک طرف سے اٹھتا چلا گیا تھا۔ اسی لمحے ڈاکو نے اسے آگے دھکیلا۔ شاٹ گن والا چونکا اور اس نے شاٹ گن سلیم کی طرف سیدھی کر لی تھی۔ ''اوئے خبردار..... اس کے پاس ہتھیار ہے، کرتے کے نیچے۔''

نو جوان ڈاکو عقب سے جھپٹا اور اس نے سلیم کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے منہ کے بل گرایا اور کرتہ اوپر کر کے کمر سے لگا پستول نکال لیا۔ رابعہ چیخنے لگی تھی۔ نو جوان ڈاکو اٹھتے ہوئے غرایا۔ ''چپ کر بی بی! مجبور نہ کر..... ہم عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔''

''اللہ کے واسطے..... اسے نہ مارنا۔'' رابعہ روتے ہوئے بولی۔

''ہم بلاوجہ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔'' نو جوان ڈاکو نرمی سے بولا اور سلیم کو اٹھنے کا حکم دیا۔

دوسرے ڈاکو نے سلیم کو غور سے دیکھا۔ ''تو بھی اپنی برادری کا ہے۔''

سلیم خاموش کھڑا رہا۔ نو جوان ڈاکو نے اسے پیچھے سے ہاتھ مارا۔ ''اوئے بولتا کیوں نہیں۔''

''نہیں جی..... میں مسافر ہوں۔'' سلیم نے مردہ لہجے میں کہا۔

''پھر ہتھیار لے کر کیوں سفر کر رہا ہے..... کیا تیرے پاس کوئی قیمتی شے ہے۔''

سلیم پریشان ہو گیا۔ ''نہیں..... میرے پاس کوئی قیمتی شے نہیں ہے۔''

''بکواس کرتا ہے یہ..... اس کی تلاشی لو۔'' دوسرے ڈاکو نے اپنے نو جوان ساتھی سے کہا۔

نو جوان ڈاکو نے سلیم کی تلاشی لی تھی۔ اس کے پاس سوائے بٹوے اور چند معمولی چیزوں کے کچھ نہیں تھا۔ اس زمانے میں موبائل فون کا رواج بہت کم اور صرف شہروں کی حد تک محدود تھا۔

''اس کے پاس صرف تھوڑی سی رقم ہے۔'' نو جوان ڈاکو نے بٹوا ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔

''چل..... اسی سے شروع کرتے ہیں۔''

''اسی سے نہ کام لیں۔'' نو جوان ڈاکو نے مشورہ دیا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ چل بھئی۔'' دوسرے ڈاکو نے کہا۔ ''سب کی باری باری تلاشی لے کر ساری رقم اور قیمتی چیزیں ادھر رکھتا جا۔ پہلے اسے لا۔''

سلیم مجبور تھا۔ اس نے ڈاکوؤں کے حکم کی تعمیل میں مسافروں کی تلاشی لینا شروع کی۔ وہ ان کی رقم اور دوسری قیمتی چیزیں بس کے ڈیش بورڈ پر جمع کرتا جا رہا تھا۔ ایک ایک کر کے اس نے سارے مسافروں کی تلاشی لی۔ پھر عورتوں سے ان کے پرس لے کر ان میں سے بھی رقم نکال لی۔ البتہ ڈاکوؤں نے عورتوں کے زیورات پر توجہ نہیں دی تھی۔ خود رابعہ سونے کی چین اور بالیاں پہنے تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ڈاکو جمع ہونے والی رقم اور قیمتی چیزوں سے مطمئن نہیں تھے۔

''چل اوئے۔'' دوسرے ڈاکو نے کنڈیکٹر کو حکم دیا۔ ''اس کے ساتھ مل کر سامان نیچے اتار..... اندر سے بھی اور اوپر سے بھی۔''

اس حکم پر مسافروں نے کچھ بے چینی ظاہر کی تھی لیکن جب نو جوان ڈاکو نے ان کو دھمکایا تو وہ چپ ہو گئے تھے۔ سلیم کا دل اندر سے رکنے لگا تھا۔ سامان پر بھی ڈاکوؤں کی نظر تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی جمع پونجی سے ہاتھ دھونے والے تھے مگر ڈاکوؤں سے الجھ کر وہ ان کے یقین کو پختہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے پاس کوئی قیمتی شے ہے اور وہ اس کی حفاظت کے لیے پستول لے جا رہا تھا۔ پستول لے جانے کا مشورہ اور پستول دونوں اس کے دوست نے دیے تھے۔ پستول اس نے چور بازار سے خریدا تھا اور اس کا کوئی لائسنس نہیں تھا۔ سلیم، کنڈیکٹر کے ساتھ مل کر سامان اتارنے لگا تھا۔ نو جوان ڈاکو اندر رہا تھا جبکہ اس کا ساتھی بس سے نیچے اتر گیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ سامان اتارتے ہوئے ان میں سے کوئی موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار نہ ہو جائے۔ سلیم اندر سے پریشان تھا۔ اس کے دونوں بیگوں میں دس لاکھ مالیت کا کیش اور سونا تھا۔ یہ ڈاکو لے جاتے تو اس کا کیا ہوتا؟ اس

UrduPhoto.com

نے جو خواب دیکھا تھا وہ بکھر جاتا۔

"نہیں۔" اس نے فیصلہ کیا۔ "میں کسی صورت اسے ان کے ہاتھ میں جانے نہیں دوں گا۔"

جب اپنے اور رابعہ کے بیگز اٹھانے کی باری آئی تو سلیم نے آگے بڑھ کر خود انہیں اتارا۔ رابعہ نے اسے غور سے دیکھا۔ "پلیز! ان سے الجھنا مت۔" اس نے محض لبوں سے کہا۔ سلیم نے سمجھ لیا تھا۔ اس نے نظریں چرالیں اور سامان اٹھائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ڈاکو دروازے کے عین پاس کھڑا تھا۔ اس وقت کنڈیکٹر بس کے سامان والے حصے سے سامان نکال رہا تھا اور ڈاکو کی توجہ اس کی طرف تھی۔ سلیم نے سوچا کہ یہ اچھا موقع ہے۔ اس نے اچانک اپنا بیگ گھما کر ڈاکو کے منہ پر مارا تھا۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ ضرب کی شدت سے وہ لڑکھڑا کر گرا اور اس کے ہاتھ سے شاٹ گن نکل کر دور جا گری تھی۔ سلیم نے دوڑ لگادی تھی۔ سامان اگرچہ وزنی تھا لیکن وہ ان میں سے ایک بھی وہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کے بیگ میں رقم تھی اور رابعہ والے سوٹ کیس میں زیورات۔

بھاگتے بھاگتے اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر دیکھا۔ ڈاکو سنبھل کر شاٹ گن کی طرف لپک رہا تھا۔ سلیم پھر پوری جان لگا کر بھاگنے لگا۔ درخت جن کے پیچھے جا کر وہ کسی قدر محفوظ ہو جاتا کچھ فاصلے پر تھے مگر اسے درختوں تک پہنچنے سے پہلے ڈاکو کی آواز سنائی دی۔ وہ دہاڑ کر اسے رکنے کا حکم دے رہا تھا۔ سلیم نے مڑ کر دیکھا۔ ڈاکو نے اس کی طرف شاٹ گن سیدھی کرلی۔ سلیم نے مڑ کر بھاگنا چاہا کہ ایک اعصاب شکن دھماکا ہوا اور وہ منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ شدید ترین دھچکے نے اسے دو بار قلابازی کھانے پر مجبور کیا۔ اس کے ہاتھ سے بیگ اور سوٹ کیس چھوٹ کر دور جا گرے اور وہ خود ایک درخت کے پیچھے آن گرا تھا۔ شروع میں اس نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا لیکن جب دایاں ہاتھ ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے سہارا دینے سے انکار کردیا۔ تب اس کی نظر اپنے پہلو پر پڑی۔ بغل اور اس سے نیچے کا حصہ خون سے تر تھا اور خون بے حد تیزی سے نکل رہا تھا۔ شاٹ گن کے خوف ناک بلٹ نے اس کی بغل سے نیچے بڑا سا سوراخ کر دیا تھا۔ کرتہ پھٹ جانے سے ادھر سے عضلات اور گوشت کے ٹکڑے صاف نظر آرہے تھے۔ ایک لمحے کو اسے چکر آگیا تھا۔ شدید ترین کمزوری اور تکلیف کے احساس سے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا تھا پھر خطرے کے احساس نے اسے چوکنے پر مجبور کردیا۔ اس نے بایاں ہاتھ ٹکایا اور اس ہار آسانی سے اٹھ گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے سہارا دیا اور آگے بڑھنے لگا۔ سخت زمین پر عقب سے قدموں کی آتی آواز بتا رہی تھی کہ ڈاکو اس کے پیچھے آرہا ہے۔ ممکن تھا کہ وہ اسے اس بار گرل ہی کردے۔ سلیم نے بیگ اور سوٹ کیس اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ نہ تو اس کا وقت تھا اور نہ ہی اس کی حالت ایسی تھی۔ وہ نہ جانے چل کیسے رہا تھا۔

لڑکھڑاتے ہوئے سلیم درختوں سے نکل کر جھاڑیوں میں داخل ہوا۔ اس نے ایک جھاڑی کی آڑ میں دیکھتے ہوئے اپنے زخم کا جائزہ لیا۔ یہ چھ سات انچ قطر کا گھاؤ تھا۔ اگر ایسا ہی زخم اس کے بائیں ہاتھ کے نیچے آیا ہوتا تو وہ اب تک مر چکا ہوتا۔ دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس طرف بھی پھیپھڑا متاثر ہوا تھا۔ اسے سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ اب زخم بتدریج تکلیف دینے لگا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح کرتہ اتارا اور اس کی گدی سی بنا کر بغل تلے زخم پر رکھ لی تاکہ خون بہنے کی رفتار کم ہو۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر اسی رفتار سے خون بہتا رہا تو وہ دس پندرہ منٹ میں مر جائے گا۔ اسی لمحے ڈاکو درختوں سے نمودار ہوا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں بیگ دقت بیگ اور سوٹ کیس اٹھا رکھے تھے اور دوسرے ہاتھ میں شاٹ گن تھی۔ وہ تجسس نظروں سے جھاڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے زمین پر موجود خون کے دھبوں کو دیکھا اور اس کی نظریں تعاقب کرتی اس جھاڑی پر مرکوز ہوگئیں جن کے پیچھے سلیم چھپا تھا۔

سلیم اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے انداز سے اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ جھاڑی کی طرف آئے گا لیکن وہ اپنی جگہ کھڑا رہا اور پھر مڑ کر واپس چلا گیا۔ سلیم کو خیال آیا، وہ اپنے ساتھی کو نہ بلانے گیا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور اوپر ڈھلان کی طرف جانے لگا۔ کپڑے کی گدی بنا کر رکھنے سے خون کی روانی پر اثر پڑا تھا۔ وہ بائیں ہاتھ سے داہنے بازو کو دبائے سنبھلتے ہوئے ڈھلان پر چڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ پلٹ کر درختوں کی طرف دیکھتا تھا اور اسے ہر چند قدم کے بعد رکنا پڑتا تھا، ورنہ مارے نقاہت کے اسے چکر آنے لگتے تھے۔ ایک بار اس کی آنکھوں کے سامنے زمین آسمان اس طرح گھومے کہ اسے لگا وہ قلابازیاں کھاتا نیچے جا رہا ہے مگر جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے خود کو ڈھلان پر بیٹھے پایا۔ پھر گرنے کے خطرے کے پیش نظر وہ بیٹھے بیٹھے اوپر سرکنے لگا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی درختوں سے نکل کر جھاڑیوں میں آیا ہو۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے

لگی۔ کیا ڈاکو اس کے پیچھے آرہا تھا؟ اس بار وہ اسے یقینی طور پر قتل کرنا چاہتا تھا۔

خوف نے سلیم کو تیزی سے حرکت میں آنے پر مجبور کیا اس نے جلدی سے اٹھتے ہوئے تیز قدموں سے ڈھلان کا یہ حصہ طے کیا۔ دوسری طرف پہنچ کر وہ خود کو کسی قدر محفوظ محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ ڈھلان اب بدل کر نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے نشیب میں دائیں طرف درختوں کا بڑا سا جھنڈ دیکھا۔ اس نے سوچا وہاں تک پہنچ جائے تو ڈاکوؤں سے محفوظ ہو جائے گا۔ وہ جلدی جلدی ڈھلان سے اترنے لگا۔ اسے دھیان نہیں رہا کہ اسے چکر بھی آسکتا ہے اور چکر بھی عین اس وقت آیا جب وہ ڈھلان کے سب سے ترچھے حصے میں تھا۔ اس بار اس نے سچ مچ قلابازیاں کھائیں اور ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر تک وہ ہوش سے بے گانہ پڑا رہا پھر اسے ہوش آیا تو نقاہت اور درد کی شدت سے اس سے ہلا نہیں جا رہا تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ وہ کیسے بچ گیا تھا۔ اتنی بلندی سے گر کر آدمی ویسے بھی مرے نہ تو شدید زخمی ہو جاتا ہے اور اس کی حالت تو ویسے بھی خراب ہو رہی تھی۔ اس نے ذرا سا سر اٹھایا۔ اسے سامنے ہی درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ وہ گر کر اس کے بے حد نزدیک آگیا۔ اس نے سوچا کہ کوشش کرے تو درختوں تک جا سکتا ہے۔

سلیم نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اس کی بغل میں دبا کپڑا ابھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ وہ لیٹے لیٹے درختوں کی طرف رینگنے لگا۔ اسے ابھی بھی خوف تھا۔ کوئی اس کے پیچھے آئے گا اور مار دے گا۔ کوشش اور جدوجہد کر کے وہ درختوں کے اس جھنڈ میں داخل ہو گیا مگر تکلیف نے اس کو بوجھل کر دیا تھا۔ ایک درخت سے ٹیک لگا کر وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے رابعہ کا خیال آیا اور اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ "تو اس کے ساتھ جو کرنے جا رہا تھا، یہ اسی کی سزا ہے۔"

"نہیں!" وہ لرز گیا تھا۔

"تو اور کیا۔" اس کے اندر کی آواز نے طنز کیا۔ "اس معصوم لڑکی کو دھوکا دینے کی سزا!!"

☆☆☆

جب سلیم نے پہلی بار رابعہ کو دیکھا تو وہ اسے اچھی لگی تھی۔ وہ حسین تھی، دلکش تھی اور سب سے بڑھ کر اسے پسند کرنے لگی تھی۔ کم سے کم اس کی آنکھوں میں سلیم نے یہی دیکھا تھا۔ بس مسئلہ یہ تھا کہ سلیم کی دلچسپی ایک اور لڑکی میں تھی۔ ماہ جبیں اس کے چچا کی لڑکی تھی اور چچا برطانیہ میں تھے۔ گزشتہ سال وہ پاکستان آئے تھے..... ماہ جبیں اس کی چھوٹی بہن اور چچا چچی۔ چچا کے تعلقات سلیم کے باپ سے اچھے نہیں تھے۔ اس کی وجہ بہت سادہ سی تھی۔ چچا جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے سلیم کے باپ نے اس سے شادی ہونے نہیں دی اور ان کی پسند کسی اور کی ہوگئی۔ چچا اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ ملک چھوڑ کر چلے گئے اور برطانیہ میں جا کر ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کرلی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان کے جوان ہونے تک وہ دوبارہ پاکستان نہیں آئے۔ اس بار بھی بیٹیوں کے مجبور کرنے پر آئے تھے جو باپ اور ماں کا ملک دیکھنا چاہتی تھیں۔ خاندان کی ایک تقریب میں اتفاق سے سلیم اور ماہ جبیں کا سامنا ہوا اور پہلی ملاقات میں وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ اس تقریب کے بعد بھی وہ چھپ کر ملتے رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے باپ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی وہ یہ پسند کرتے تھے کہ ان کے اہل خانہ آپس میں ملیں۔

سلیم اور ماہ جبیں کی ملاقاتیں زیادہ دن چھپ نہیں سکی تھیں۔ دونوں کے گھر والوں کو پتا چل گیا اور ان پر پابندی لگ گئی مگر اس کے باوجود وہ آپس میں رابطہ کرلیا کرتے تھے۔ پھر ماہ جبیں اور اس کے گھر والوں کے واپس جانے کے دن قریب آگئے۔ سلیم ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب چچا نہ تو خود آئیں گے اور نہ ہی ماہ جبیں کو آنے دیں گے۔ جانے سے ایک روز پہلے اسے ماہ جبیں کا پیغام ملا کہ وہ اس سے ہوٹل میں ملنا چاہتی ہے۔ سلیم وقتِ مقررہ پر ہوٹل پہنچا تو ماہ جبیں کے ساتھ اپنے چچا کو بھی موجود پا کر حیران رہ گیا تھا۔

"حیران مت ہو۔" چچا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس لڑکی کی ضد نے مجھے مجبور کردیا ہے اگر تم ماہ جبیں سے شادی کرنا چاہتے ہو تو میری ایک شرط ہے۔"

"مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"پہلے سن تو لو۔" چچا نے طنز کیا۔ "تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا ملک چھوڑ کر انگلینڈ آنا ہوگا۔ دوسرا وہاں اپنے بل بوتے پر آنا ہوگا۔ تیسرے تمہیں گھر داماد بن کر رہنا ہوگا۔"

"مجھے..... منظور ہے۔" اس نے پھر جلدی سے کہا۔

چچا زہریلے انداز میں ہنسا تھا۔ "دیکھیں گے..... کتنی شرطیں پوری کرتے ہو۔"

"ماہ جبیں کی خاطر مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے۔"

UrduPhoto.com

ماہ جبیں کے انگلینڈ واپس جانے کے بعد اس نے چوری چھپے انگلینڈ جانے کی کوشش شروع کر دی تھی مگر جلد اسے پتا چل گیا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ باہر جانے کے لیے بہت ساری رقم کی ضرورت تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ اکثر افراد جو باہر لے جانے کا کام کرتے تھے دراصل اسمگلر تھے اور پچانے شرط رکھی تھی کہ اسے قانونی طور پر آنا ہوگا۔ اگر وہ اسمگل ہو کر جاتا تو ان کی شرط پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جستجو جاری رکھی کہ کوئی درست طریقہ مل جائے۔ آخر اسے انٹرنیٹ سے ایک ایسے تعلیمی ادارے کا پتا چلا جو داخلہ دیتا تھا اور اس کی سفارش پر برطانوی ہائی کمیشن ویزا جاری کرتا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ طالب علم کو فیس پیشگی ادا کرنی تھی اور فیس سات ہزار برطانوی پاؤنڈز تھی جو اس زمانے میں تقریباً ساڑھے چھ لاکھ روپے بنتے تھے اور اتنی بڑی رقم سلیم کے پاس نہیں تھی۔ اس نے ڈپلوما کر رکھا تھا، اس بنیاد پر اسے انجینئرنگ میں داخلہ مل سکتا تھا۔ بس اسے فیس ادا کرنا تھی۔

سلیم ذاتی طور پر دو لاکھ کر سکتا تھا۔ اس کے والد نے کچھ شیئرز لے رکھے تھے جو گھر کی الماری میں پڑے رہا کرتے تھے۔ یہ کھلے شیئرز تھے اور کوئی بھی ان کو فروخت کر سکتا تھا مگر باقی رقم کہاں سے آتی؟ فی الحال اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ان ہی دنوں وہ رابعہ سے ملا تھا۔ پہلی ملاقات کے بعد گلی میں کئی بار آمنا سامنا ہوا اس نے محسوس کیا کہ وہ اس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ سلیم نے بھی اسے ایسا ہی تاثر دیا تھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں سوائے وقت گزاری کے اور کچھ نہیں تھا لیکن ایک روز مرکزی محفل میں اس نے ایسے ہی ذکر کر دیا تو سب اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ایک کزن نے کہا۔

''دشمن کی لڑکی سے محبت!''

''تو کیا ہوا..... وہ بھی تو ہماری لڑکی بھگا کر لے گئے تھے۔'' دوسرا کزن بولا۔

''اپنا شیر بدلہ لے گا۔''

''گڑی پھنسالے..... شہزادے سلیم۔''

''خدا کو مانو۔'' تابڑ توڑ حملوں سے بوکھلا کر اس نے کہا تھا۔ ''یہ ایسے ہی شغل ہے۔''

''دل لگی ہی آخر میں دل کی لگی بن جاتی ہے۔'' ایک کزن نے کہا۔ ''ہماری مان تو اسے بھگا کر لے جا..... کچھ دن موج میلا کر نا۔''

''یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' سلیم نے اس کی بات کاٹی۔

''تو کیا شادی کرے گا؟'' دوسرا تیکھے لہجے میں بولا۔

''اوہ، میری جان چھوڑو..... ایسا کچھ نہیں کرنا ہے۔''

مگر وہ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والے کہاں تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے سلیم کو راضی کر لیا کہ بات اشارے کنائیوں سے آگے بڑھائی جائے۔ سلیم نے خط لکھا تو رابعہ نے مثبت جواب دیا اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا..... اور تب سلیم کے ذہن میں ایک منصوبہ آیا تھا۔ اس نے رابعہ کے اصرار پر ماں باپ کو اس کے گھر بھیجا۔ حسب توقع انہوں نے انکار کر دیا۔ سلیم نے اس بات کو بہانہ بنا کر رابعہ پر دباؤ ڈالا کہ انہیں گھر سے بھاگ کر کورٹ میرج کر لینی چاہیے۔ رابعہ نے کچھ دنوں تک انکار کیا پھر ہار مان لی۔ وہ اس کے ساتھ کورٹ میرج پر راضی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''میں نے اسے دھوکا دیا۔'' سلیم نے اذیت سے سانس لیتے ہوئے سوچا۔ ''میرا ارادہ کراچی جا کر برطانوی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا تھا اور جیسے ہی داخلہ ہوتا میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جاتا، اس بے چاری کا جو بھی ہوتا۔''

اس کے ارادے کی تکمیل سے پہلے ہی اللہ نے اسے اس کی نیت کی سزا دے دی تھی۔ وہ جس پیسے کے لیے اس معصوم لڑکی کو اس کے گھر سے نکال کر لایا تھا وہ ڈاکو لے جا چکے تھے۔ اپنے گھر سے چرائے ہوئے شیئرز بیچ کر اس نے دو لاکھ روپے حاصل کیے تھے، وہ بھی جا چکے تھے۔ اسے گولی لگی تھی اور شاید وہ اس ویرانے میں مر جاتا۔ اس خیال نے اسے لرزا دیا تھا۔ کیا وہ سچ مچ اس ویران جگہ مر جائے گا؟ اپنے گناہوں کی تلافی کیے بغیر!

''نہیں..... تجھے کوشش کرنی چاہیے۔ ممکن ہے میری زندگی ہو اور میں بچ جاؤں۔'' اس نے سوچا۔ وہ ہمت کر کے درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ واپس جانے کا مطلب تھا کہ ڈاکو اسے سچ مچ مار دیں۔ وہ تنوں اور شاخوں کا سہارا لے کر جھنڈ کے دوسری طرف بڑھنے لگا۔ جھنڈ سے نکلا تو سامنے ایک بلند ٹیلا تھا جس پر نیچے سے پتھروں سے بنی چار دیواری نظر آ رہی تھی۔ بیشتر مقامات پر یہ چار دیواری ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی۔ اس کے اندر امید جاگی۔ شاید یہاں کوئی رہتا ہو جو اس کی مدد کرے۔ وہ کوشش کر کے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ کسی زمانے میں اوپر جانے والا راستہ بھی موسموں کے ہاتھوں برباد ہو چکا تھا۔ اب پورے ٹیلے پر جھاڑ جھنکاڑ اور گھاس پھوس اگی تھی۔ سلیم اس کے سہارے اوپر جانے لگا۔ اس کا دایاں بازو بے جان انداز میں جھول رہا تھا اور جب وہ

حرکت کرتا تو سلیم کو اذیت کی نئی منزلوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ جیسے تیسے وہ ٹیلے کے اوپر پہنچا تو سامنے مسجد کی محراب پر نظر پڑی۔ یہ مسجد ویران تھی۔ اسے مایوسی ہوئی۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ٹیلے پر چڑھنے کے لیے اس نے اپنی ساری توانائی خرچ کر دی تھی۔ خون کے زیادہ بہہ جانے سے وہ بے پناہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ بار بار اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ محراب تلے پہنچا۔ کسی نے اس کے اندر سے کہا۔ ''یہ خانہ خدا ہے..... اس سے مانگ۔'' وہ گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا پھر اس سے بیٹھا بھی نہیں گیا تو وہ لیٹ گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا آخری وقت آ گیا ہے اور اس کی جان نکلنے والی ہے۔ وہ لرز گیا تھا۔ اس نے بے ساختہ فریاد کی۔

''اللہ..... میں مرنا نہیں چاہتا..... میں کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں..... میرے مالک مجھے ایک موقع دے بس ایک موقع..... عنایت فرما۔ تیری قدرت میں سب ہے۔''

دعا کرتے کرتے اس پر غشی طاری ہونے لگی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اچانک دھچکے سے اس کی آنکھ کھلی اور اس نے خود کو بس کی نشست پر بیٹھے پایا۔ دھچکا بس کے اچانک رکنے کا تھا۔ اس کی نظر سامنے پڑی۔ دونوں ڈاکو بس میں سوار ہو رہے تھے اور رابعہ اس سے التجا کر رہی تھی کہ ان سے نہ الجھے، وہ بے حد خطرناک لوگ تھے۔ کچھ دیر کے لیے تو سلیم دم بہ خود رہ گیا تھا۔ کیا وہ اب تک کوئی خواب دیکھ رہا تھا لیکن یہ کیسا خواب تھا؟ ڈاکو اس کے سامنے تھے۔ اسے سب اچھی طرح یاد تھا حد یہ کہ زخم کی اذیت بھی۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ دائیں بغل کی طرف گیا تھا، اس کا جسم بالکل صحیح سلامت تھا۔

''کیا اللہ نے اسے ایک موقع دیا تھا؟'' اس نے سوچا۔

☆☆☆

حیات خان بس میں داخل ہوا اور پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق بس کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے نہ جانے کیوں یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ پہلے بھی وہ کئی بار بسوں میں واردات میں شامل رہ چکا تھا لیکن آج اس کے دل کی عجیب سی حالت تھی۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے مسافروں کو دیکھا۔ وسطی حصے میں ایک نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ اسے ان کی حالت معمول سے ہٹ کر لگی تھی۔ باقی مسافروں کے چہروں پر خوف تھا اور وہ دونوں متعجب سے بیٹھے تھے۔ جب وہ لڑکے کے پاس سے گزرا تو اس نے اسے بڑبڑاتے سنا تھا۔

''میرے خدا..... یہ کیا ہو رہا ہے۔''

حیات خان کو لگا کہ وہ موجودہ صورت حال پر متعجب نہیں تھا۔ اس کی حیرت کی وجہ کچھ اور تھی پھر اس نے لڑکے کو لڑکی سے کہتے سنا تھا۔ ''مجھے معاف کر دو..... میں تمہیں دھوکا دے رہا تھا رابعہ۔''

''کیا کہہ رہے ہو سلیم؟'' رابعہ حیران رہ گئی تھی۔

''رابعہ! خدا نے مجھے موقع دیا ہے..... نہ جانے کب مہلت ختم ہو جائے۔ اس سے پہلے میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ یہ سچ ہے، میں تمہیں دھوکے سے لے جا رہا ہوں۔ میرا ارادہ تمہیں چھوڑ کر انگلینڈ جانے کا تھا۔''

''لیکن کیوں سلیم؟'' رابعہ کی آواز بھیگنے لگی۔ دونوں بہت آہستہ بات کر رہے تھے، اس کے باوجود ان کے پیچھے کھڑے حیات خان کو ان کی ساری باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سلیم رابعہ کو بتا رہا تھا کہ وہ اپنی کزن سے محبت کرتا ہے اور اسے پانے کے لیے انگلینڈ جانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی اس لیے اس نے رابعہ کو محبت کے جال میں پھنسایا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔

''رابعہ! میں تمہارا مجرم ہوں..... کوئی تاویل پیش نہیں کروں گا..... کوئی درخواست نہیں کروں گا۔ ممکن ہے اگر تم مجھے معاف کر دو تو خدا بھی معاف کر دے۔''

حیات خان کا خیال تھا کہ لڑکی اس پر برس پڑے گی لیکن جب وہ بولی تو اس کا انداز بھی غیر معمولی تھا۔ ''سلیم! میں تمہیں کیسے معاف کروں، میں تو خود گناہ گار ہوں۔ میں نے ماں باپ اور بھائیوں کے اعتماد کا خون کیا۔ میں تو اللہ کی گناہ گار ہوں..... میں تمہیں کیسے معاف کروں۔''

''رابعہ! اس چکر سے بچ نکلے تو ہم واپس چلے جائیں گے اور اپنے ماں باپ سے معافی مانگ لیں گے۔''

''کیا وہ ہمیں معاف کر دیں گے؟ دن چڑھے یہ بات سب میں پھیل چکی ہوگی۔ ان کی جو بدنامی ہونا تھی، ہو چکی ہو گی۔''

''ممکن ہے ابھی ہمارے گھر والوں نے یہ بات چھپائی ہو۔'' سلیم پُرامید لہجے میں بولا۔ ''رابعہ! اللہ سے دعا کرو کہ سب ٹھیک ہو جائے۔''

رابعہ ہچکچائی۔ ''سلیم تم اچانک..... ایسی بات کیوں کر رہے ہو؟''

''کیونکہ خدا نے مجھ گناہ گار کو ایک موقع دیا ہے۔ رابعہ! میں یہ پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔''

رابعہ چونکی تھی۔ ''سلیم! کیا تم بھی مسجد تک گئے تھے؟''

''ہاں۔'' سلیم بولا۔ ''لیکن تم کیسے جانتی ہو؟''

UrduPhoto.com

''میں بھی وہاں تک جا چکی ہوں۔ سلیم میں نے بھی یہ سب دیکھا ہے..... میں نے بہت خوفناک واقعات دیکھے تھے۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ یہ سب پہلے جیسا ہو جائے اور ایسا ہی ہوا۔''

''رابعہ یقین کرو..... میں اس تجربے سے نہ گزر چکا ہوتا تو شاید کبھی یقین نہ کرتا۔''

''ابھی یہ ہمارا سامان بس سے نیچے اتروائے گا۔'' رابعہ بولی۔

حیات خان کے لیے ان کی باتیں عجیب تھیں لیکن رابعہ کی اس بات نے اسے چونکا دیا تھا۔ ان کو کیسے پتا چلا کہ وہ سامان بھی اتروائیں گے۔ اس دوران میں قادر بخش نے کنڈیکٹر سے لوگوں کی تلاشی لے کر ان کی رقم اور قیمتی چیزیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ حیات خان نے قادر بخش کی طرف دیکھا، وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ حیات خان نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ اس کی آخری واردات تھی اور اس کے بعد وہ پھر کبھی یہ کام نہیں کرے گا۔ اس نے قادر بخش سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس واردات سے حاصل ہونے والی رقم اور چیزوں میں سے کچھ نہیں لے گا۔ وہ سب قادر بخش کا ہوگا۔

کنڈیکٹر نے سب کی تلاشی لے لی تھی۔ اس نے سلیم کی تلاشی بھی لی اور اس سے اس کا پرس لے لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر قادر بخش نے کنڈیکٹر کو سامان اتارنے کا حکم دیا۔ وہ مسافروں کا سامان ریک سے اتارنے کے لیے بڑھا تھا کہ حیات خان نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور خود قادر بخش کے پاس پہنچ گیا۔

''سامان چھوڑو..... بس رقم لو اور نکلو۔'' حیات خان نے آہستہ سے کہا۔

قادر بخش نے اسے سخت نظروں سے دیکھا۔ ''پاگل ہوا ہے..... اصل مال تو سامان میں ہوگا۔ یہ کیا ہے، صرف ستر پچھتر ہزار روپے۔ اوئے تو منہ کیا دیکھ رہا ہے، کام کر۔''

حیات خان خاموشی سے پیچھے آ گیا۔ قادر بخش فیصلہ کر چکا تھا۔ شاید اس واردات سے وہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رابعہ کو کہتے سنا۔ ''میں نے کہا تھا نا..... یہ نہیں مانے گا۔ سلیم تم کوئی مزاحمت مت کرنا۔''

''پہلے میں شاید تمہاری بات نہ مانتا۔'' سلیم بولا۔ ''لیکن اب ان چیزوں کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ بس یہ خیال ہے کہ یہ ہمارے گھر والوں کا ہے جو ہم نے دھوکے سے حاصل کر لیا۔ کاش ہم یہ سب بھی ان کو واپس کر سکیں۔''

''مشکل ہے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''یہ سامان نہیں چھوڑیں گے اور مال جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا ہے۔''

''میں اس سے بات کرتا ہوں۔'' سلیم نے قادر بخش کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، یہ صورت سے ہی خوفناک لگتا ہے۔'' رابعہ سہم گئی تھی۔ ''تم اس سے بات نہیں کرو گے۔''

''نہیں..... میں اس سے درخواست کروں گا۔'' سلیم نے اسے سمجھایا۔ ''میں لڑنے تھوڑی جا رہا ہوں۔''

رابعہ کے منع کرنے کے باوجود سلیم کھڑا ہو کر قادر بخش کی طرف بڑھا تو وہ چوکنا ہو گیا۔ اس نے شاٹ گن کا رخ سلیم کی طرف کر دیا اور غرایا۔ ''کیا ہے..... کیوں اٹھا ہے؟''

''میری تم سے درخواست ہے، ہمارا سامان مت لو۔ اس میں دوسروں کی امانتیں ہیں۔''

''بکواس نہ کر..... واپس جا۔'' قادر بخش بولا۔ اس نے شاٹ گن اوپر کی تھی۔

رابعہ اضطراب سے اٹھ کر سلیم کے پاس آئی۔ ''خدا کے لیے اس کے منہ مت لگو..... تم واپس آؤ۔''

''نہ بی بی..... اتنی آسانی سے کیسے واپس جائے گا۔'' قادر بخش استہزائیہ انداز میں بولا اور چند قدم آگے آیا۔ اس نے اچانک شاٹ گن کا دستہ سلیم کے پیٹ میں مارا۔ وہ ضرب اور کرب کی شدت سے دہرا ہو گیا تھا۔ رابعہ نے چیخ ماری۔ اس نے سلیم کو سنبھالا۔ قادر بخش نے اس سے کہا۔

''اسے لے جا، ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔''

رابعہ سلیم کو سہارا دے کر سیٹ تک لائی۔ حیات خان ان کے نزدیک آیا۔ اس نے سلیم سے کہا۔

''خود پر قابو رکھو۔''

''سنو..... ہمارے پاس سامان میں..... امانتیں ہیں۔'' سلیم نے مشکل سے کہا۔ ''اپنے ساتھی سے کہو ہمارے سامان کو چھوڑ دے۔''

قادر بخش سن رہا تھا۔ وہ غصے سے بے قابو ہو کر سلیم کی طرف آیا۔ حیات نے اسے روک لیا۔ ''اپنا کام کرو اسے چھوڑو۔''

''میں ہمیشہ کے لیے اس کی زبان بند کر دوں گا۔'' قادر بخش زہریلے لہجے میں بولا۔

''تو باہر جا..... میں اسے دیکھ لوں گا۔'' حیات خان نے اسے سمجھایا۔ ''ابھی کام کر کے نکلنا بھی ہے۔''

قادر بخش سلیم اور رابعہ کو گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ کنڈیکٹر مسافروں کا سامان اتار کر دروازے کے سامنے ڈھیر کر رہا

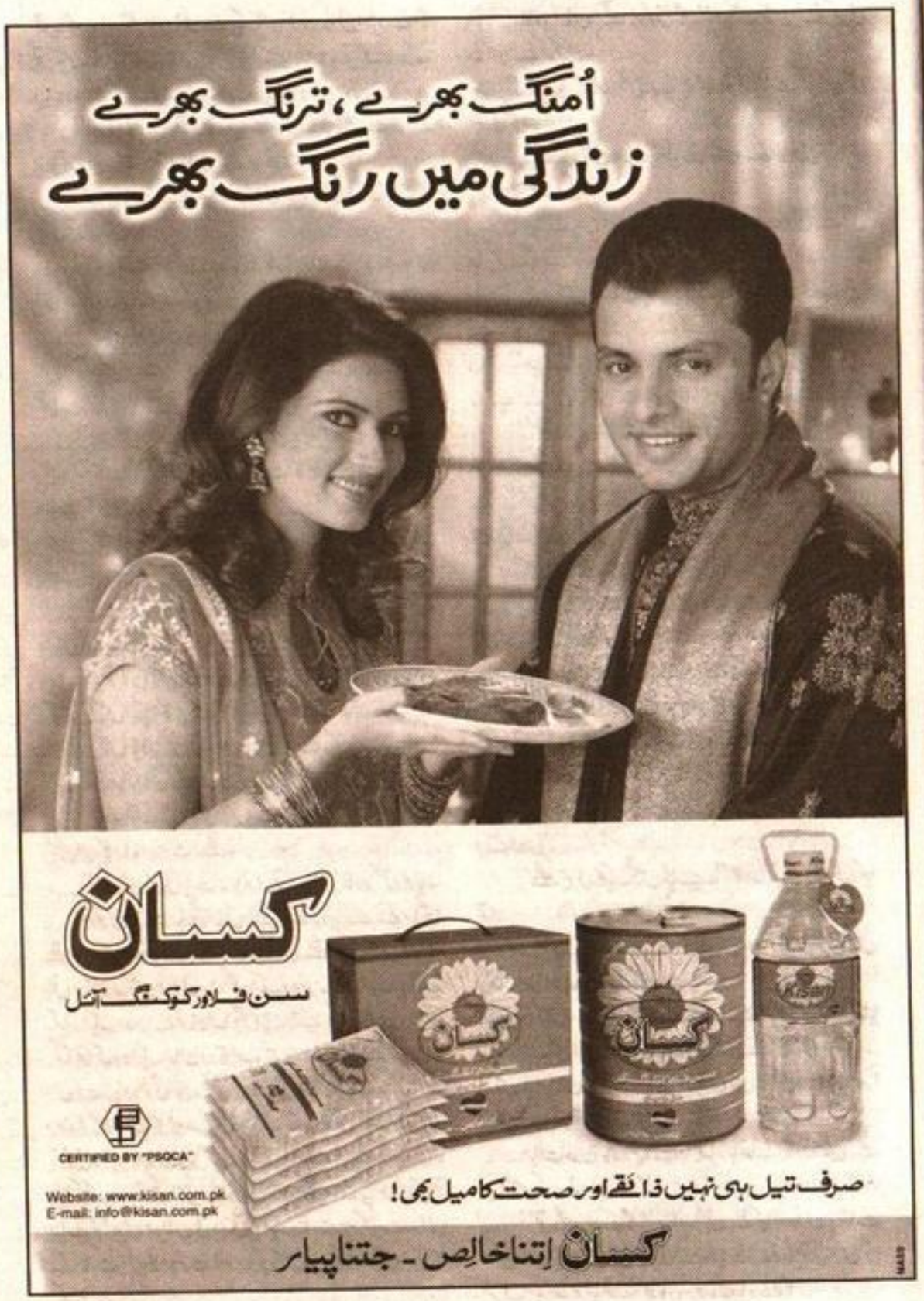
اُمنگ بھرے، ترنگ بھرے
زندگی میں رنگ بھرے
کسان
سن فلاور کوکنگ آئل
CERTIFIED BY "PSQCA"
Website: www.kisan.com.pk
E-mail: info@kisan.com.pk
صرف تیل ہی نہیں ذائقے اور صحت کا میل بھی!
کسان اِتنا خالِص ۔ جتنا پیار

تھا۔ جب وہ سلیم اور رابعہ کے بیگ اور سوٹ کیس اتارنے لگا تو سلیم نے مزاحمت کا ارادہ کیا تھا لیکن رابعہ نے اسے روک دیا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"تم آرام سے بیٹھو۔" حیات خان نے سلیم کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ کنڈیکٹر سامان لے گیا تھا۔

"وہ ہمارے لیے بہت ضروری ہے بھائی۔" رابعہ نے بھیگی آواز میں کہا۔

"میں اپنے ساتھی سے بات کرتا ہوں۔" حیات خان بس کے دروازے تک آیا۔

"تو باہر کیوں آرہا ہے؟" قادر بخش بولا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" حیات خان نیچے اتر آیا۔

"بعد میں بات کرنا..... ابھی ان پر نظر رکھ۔"

"قادر بخش اس مرد اور عورت کا سامان چھوڑ دو۔" حیات خان اس کے پاس آکر بولا۔

"نہیں..... مجھے یقین ہے کہ ان کے سامان میں مال ہے۔"

"بے شک ہوگا لیکن وہ مال کسی کی امانت ہے۔ وہ ان کو واپس کرنا ہے۔"

"یہ تو آج مولانا کیوں بن رہا ہے؟" قادر بخش نے طنز کیا۔ "ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔"

"نہیں قادر بخش..... ان کو چھوڑ دے۔"

"تو سارا مال مجھے دینے کو کہہ چکا ہے۔"

"بے شک میں اس میں سے ایک روپیا نہیں لوں گا لیکن ان کا سامان مت لے۔"

"اگر میں تیری بات نہ مانوں تو.....؟" قادر بخش بولا۔

دونوں گزشتہ پانچ سال سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور ایک دوسرے سے بے حد مخلص تھے۔ کبھی ڈاکے کے مال پر تنازعہ نہیں ہوا تھا، نہ کبھی ایک دوسرے کی نیت پر شک کیا۔ ایک دوسرے کو ہمیشہ اچھی چیز دینے کی کوشش کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک جان دو قالب ہیں۔ حیات نے زمین لی تو اس سے زیادہ خوشی قادر بخش کو ہوئی تھی اور جب قادر بخش نے دھندا چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو حیات خان خوش تھا۔ اس نے آخری واردات سے حاصل ہونے والی ساری رقم قادر بخش کو لینے کو کہہ دیا تھا مگر اس لمحے جب قادر بخش نے یہ سوال کیا تو حیات کو محسوس ہوا ان کی دوستی کا لبادہ تار تار ہو گیا ہے۔ ان کے سامنے اس کا دوست اور ساتھی نہیں..... کوئی اجنبی حریف کھڑا ہے۔

"قادر! میں تجھے روکوں گا۔" حیات خان نے گہری سانس لے کر کہا۔

"کیسے؟" قادر بخش نے چوکنا ہو کر شاٹ گن سیدھی کر لی تھی۔

"جیسے بھی ممکن ہوا۔" حیات خان نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

"حیاتے..... آپس میں لڑے تو جو ملا ہے اس سے بھی جائیں گے۔"

"تب اس سامان کو چھوڑ دے..... باقی سب تیرا ہے۔"

"حیاتے..... ہمیں ملا ہی کیا ہے..... ستر اسی ہزار روپے ملے ہیں۔ ممکن ہے باقی سامان سے بھی کچھ نہ ملے۔"

"ممکن ہے..... اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ ان کا سامان چھوڑ دے۔"

"یہ تیرے کیا لگتے ہیں؟" قادر بخش چڑ کر بولا۔ "بہن بہنوئی۔"

"ایسا ہی سمجھ لے۔"

قادر بخش سوچنے لگا پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن میں سامان دیکھوں گا۔"

"جب تجھے لینا نہیں ہے تو دیکھنے کا فائدہ؟"

"حیاتے..... میرے سر پر نہ چڑھ۔" قادر بخش کو غصہ آگیا تھا۔ "یہ نہ بھول تجھے سب میں نے سکھایا ہے۔ اس جگہ تو آج میری وجہ سے....."

"مجھے پتا ہے۔ اگر تو میرا سب مانگ لے تو سوچے بغیر دے دوں۔"

"مجھے تیری بھیک نہیں چاہیے۔" قادر بخش اور بھڑک گیا تھا۔

"تم جانتے ہو میں نے کبھی تم میں اور خود میں فرق نہیں رکھا۔ میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے۔"

"نہیں..... قادر بخش نے ہمیشہ اپنے بازو سے کما کر کھایا ہے۔ اب بھی اپنی کمائی کھائے گا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں یہ سامان ضرور دیکھوں گا۔ اس میں جو بھی ہے، وہ میرا ہے۔"

حیات خان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا تھا۔ "قادر! میں تجھے ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

"تو مجھے روکے گا؟" قادر بخش نے کہا اور اس پر شاٹ گن تان لی۔ اتنی ہی تیزی سے حیات نے پستول اس کی طرف سیدھا کر لیا تھا۔ "اوہ..... تو مجھے مارے گا؟"

"ہاں..... اگر تم ایسے نہیں مانو گے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

"ایک اجنبی شخص اور اس کی عورت کے لیے؟" قادر بخش کے انداز میں بے یقینی تھی۔

"ہاں..... مگر تو بھی تو مجھے مارنا چاہتا ہے، ذرا سے مال کی خاطر۔"

"نہیں..... قادر بخش نے مال کی کبھی پروا نہیں کی۔" وہ غصے سے بولا۔ "تو مجھ پر ان لوگوں کو ترجیح دے رہا ہے۔"

"قادر بخش اس کی وجہ ہے۔" حیات خان نے نرمی سے کہا۔ "میری بات مان جا۔"

"نہیں..... اس سامان میں لاکھوں کا مال ہے..... میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"میرے جیتے جی تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔"

"تیرے جیتے جی نہ سہی..... تیری لاش پر تو لگا سکتا ہوں نا۔" قادر بخش مسکرایا۔ اس نے شاٹ گن اوپر کی۔ اب تک حیات خان کو یقین نہیں تھا کہ قادر بخش اس پر گولی چلا سکتا ہے لیکن اس لمحے اس نے قادر کی آنکھوں میں قاتل چمک دیکھی تھی۔ خطرے کا احساس کرتے ہوئے حیات خان تیزی سے بائیں طرف گرا تھا اور اس نے شاٹ گن سے نکلنے والے شعلے کی لپک دیکھی تھی۔ گولی اس کے بازو کے اتنے نزدیک سے گزری کہ اس نے گولی کی حدت بھی محسوس کی تھی۔ گرتے ہی وہ قلابازی کھا کر سیدھا ہوا تو قادر بخش بس کے سامنے والے حصے کے عقب میں پناہ لے رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ شاٹ گن کو دوبارہ لوڈ کر رہا تھا۔ حیات نے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے دائیں بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ قادر بخش نے چیخ ماری تھی اور شاٹ گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

حیات خان اٹھ کر درختوں کی طرف بھاگا۔ اسے چند لمحے کی مہلت ملی تھی۔ اس کی بہت زیادہ خوش قسمتی تھی جو اتنے نزدیک سے شاٹ گن کا فائر اسے نہیں لگا تھا مگر قادر بخش دوسری بار غلطی نہیں کرے گا۔ وہ درختوں میں داخل ہو رہا تھا کہ دوسرا فائر ہوا اور اس بار بھی وہ بال بال بچا تھا۔ گولی اس کے سر سے گزر کر درخت کے تنے پر لگی تھی اور اس نے خاصا بڑا سوراخ کر دیا تھا۔ حیات نے مڑ کر قادر بخش کی طرف دو فائر کیے۔ اس نے احتیاط رکھی کہ گولی بس کی طرف نہ جائے۔

اس نے قادر بخش کو بھاگ کر بس کے دوسری طرف موجود درختوں میں جاتے دیکھا۔ درختوں کا یہ سلسلہ نیم دائرے میں گھومتا آپس میں مل رہا تھا۔ حیات کو خطرہ احساس ہوا۔ قادر بخش پیچھے سے درختوں کے درمیان سے اس کے سر پر پہنچ جاتا اور اسے پتا بھی نہ چلتا۔ وہ درختوں سے نکلا اور بھاگ کر جھاڑیوں کے درمیان چلا گیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ قادر بخش درختوں سے ہوتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ اسے جھاڑیوں میں جاتے دیکھ کر قادر بخش نے ایک اور فائر کیا تھا۔ گولی خاصے فاصلے پر مٹی میں لگی اور گرد اڑی تھی۔

حیات خان جھاڑیوں میں ہو کر ڈھلان کے ساتھ ساتھ اوپر جانے لگا۔ اس کی کوشش تھی کہ قادر بخش کی نظروں سے اوجھل رہے۔ وہ اسے قتل کرنے کے درپے تھا، ورنہ شاٹ گن جیسے مہلک ہتھیار سے اس پر پے در پے فائر کیوں کرتا۔ دو بار تو وہ نہ جانے کیسے بچا تھا۔ شاید بازو کے زخم نے قادر بخش کو پاگل کر دیا تھا۔ وہ اس کا پیچھا کر کے اسے مارنا چاہتا تھا۔ اس وقت حیات کو خیال آیا کہ کیا وہ اپنی جان بچانے کے لیے قادر بخش کو قتل کر سکتا تھا؟ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے مگر جب قادر بخش نے اس پر ایک فائر اور کیا اور گولی اس کے پاس زمین پر لگی تو گھبرا کر اس نے اس سمت میں بے تحاشا فائرنگ کی جس طرف سے گولی آئی تھی۔ وہ اس وقت تک ٹریگر دباتا رہا تھا جب تک چیمبر سے خالی "کلک..... کلک" کی آواز آنے نہیں لگی۔ پستول خالی ہو گیا تھا۔ اس نے زمین پر دراز ہوتے ہوئے جلدی جلدی گولیاں نکال کر میگزین میں بھریں۔ ساتھ ساتھ وہ پیروں کے بل اوپر سرکتا جا رہا تھا۔ ذرا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ اٹھ کر اوپر کی طرف بھاگا۔ قادر بخش نے پھر فائر کیا لیکن گولی کہیں دور لگی تھی۔ حیات کو خدشہ تھا، اس جگہ وہ مارا جائے گا۔ ڈھلان درختوں کے سامنے تھی اور یہاں چھپنے کے مواقع کم تھے۔ حیات نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اوپر جانے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار ڈھلان کے دوسری طرف پہنچ جاتا تو محفوظ ہو جاتا۔ اس نے ڈھلان پر قدم رکھا اور دوسری طرف کود گیا۔ اسے جھٹکا سا لگا تھا۔ چند گز نیچے گرنے کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو دائیں پہلو میں شدید تکلیف اٹھی تھی۔

"شاید کوئی پتھا چڑھ گیا ہے۔" اس نے پہلو دبایا اور اس کا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر پہلو دیکھا۔ وہاں سے قمیص کا کپڑا اُدھڑا ہوا تھا اور اس سے زخم جھانک رہا تھا..... کوئی چار انچ لمبا چوڑا۔ اس سے رستے ہوئے مسلز اور آنتیں جھانک رہی تھیں۔ اسے گولی لگی تھی۔ زخم کے وار سے زیادہ اسے تعجب ہوا تھا۔ اسے گولی کب لگی؟ اس نے آواز نہیں سنی۔ نہ ہی اسے کچھ محسوس ہوا تھا۔ درد غیر محسوس انداز میں پھیل رہا تھا۔ اس کے لیے سانس لینا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔

UrduPhoto.com

وہ اپنے پہلو کو دباتے ہوئے اٹھا۔ اسے قیامت سے گزرنا پڑا تھا۔ زخم خوفناک تھا۔ خون جس تیزی سے بہہ رہا تھا' اسے لگا کہ چند منٹ میں اس کا جسم خون سے خالی ہو جائے گا۔

''میں کیا کروں؟'' اس نے خوف زدہ ہو کر سوچا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔''

وہ زخم دبائے دبائے درختوں کی طرف جانے لگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اس کھنڈر اور ویران ہو جانے والی مسجد کے پاس تھا جہاں اس نے چند گھنٹے پہلے نماز پڑھی تھی۔ یہ مسجد اتفاق سے اس کے علم میں آئی تھی۔ ایک روز قادر بخش کے پاس آنے کے لیے وہ اس جگہ سے گزر رہا تھا کہ زوردار بارش ہونے لگی تھی، وہ پناہ کے لیے درختوں میں آیا تھا۔ جب بارش تھمی تو وہ نہ جانے کیوں درختوں کے پچھلے حصے کی طرف گیا تھا۔ اس نے ٹیلا دیکھا اور اوپر چڑھا تو اسے پہلی بار مسجد کے کھنڈرات نظر آئے۔ نہ جانے کیوں خانہ خدا کی ویرانی دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ اس نے کھڑی رہ جانے والی محراب کے اندر صفائی کی اور اذان دے کر نماز پڑھی تھی۔ اس کے بعد یہ اس کا معمول بن گیا تھا۔ وہ جب اس جگہ سے گزرتا تھا مسجد کی صفائی کرتا اور اذان دے کر نماز پڑھتا تھا۔ حالانکہ وہ نماز کا عادی نہیں تھا۔ بچپن سے جوانی تک اس نے شاذ ہی جمعے کے سوا کوئی نماز پڑھی تھی۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا درختوں سے نکلا۔ پہلو کا درد ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ منہ کھول کر گہرے سانس لیتا ہوا ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ خون پہلو سے بہتا اور دائیں ٹانگ سے ہوتا ہوا اس کے جوتے میں بھرنے لگا تھا۔ ایک دو بار اس کا پاؤں پھسلا تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹیلے کے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے چار دیواری میں قدم رکھا تو اس کا جسم لرزنے لگا تھا۔ وہ سسکتے ہوئے محراب کی طرف بڑھا اور عین اس جگہ گر گیا جہاں وہ نماز پڑھتا تھا۔ درد کی شدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسے اپنی جان نکلتی لگ رہی تھی۔ ''کیا اس کا آخری وقت آ گیا تھا؟'' اس نے سوچا اور لرز گیا۔ موت کے خیال سے نہیں — بلکہ اس خیال سے کہ وہ گناہوں سے بھرا نامۂ اعمال لے کر خدا کے حضور جانے والا ہے۔ اسے اپنی بخشش کی امید بھی نہیں تھی۔ بے ساختہ اس نے دعا کی۔

''اے اللہ! میرا آخری وقت آ گیا ہے تو تیری مرضی — لیکن مجھے اپنے کیے کی تلافی کا ایک موقع دے — مجھے ایک موقع دے میرے اللہ —'' اس کے آخری الفاظ چیخ کی طرح نکلے تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے پہلو کے زخم سے جان نکلی ہو — اور پھر ہر طرف تاریکی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

قادر بخش غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ حیات اس پر گولی چلائے گا اس نے سوچا بھی نہیں تھا — آج حیات نے دوسروں کو اس پر ترجیح ہی نہیں دی تھی بلکہ اسے مارنے کی کوشش بھی کی تھی، اس پر فائر کیا تھا — اور یہ سوچتے ہوئے وہ بھول گیا تھا کہ ایک منٹ پہلے اس نے بھی حیات پر شاٹ گن سے فائر کر کے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ نہ جانے کیسے بچ گیا تھا۔ اتنے قریب سے قادر بخش کا نشانہ خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے نشانے بازی کی مشق تھی۔ حیات خان نے زمین سے اٹھتے ہوئے اس پر فائر کیا تھا۔ وہ اس وقت شاٹ گن لوڈ کر رہا تھا۔ گولی اس کے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس کے بازو میں آگ سی لگ گئی تھی۔ شاٹ گن چھوٹ کر زمین پر جا گری۔ فائرنگ کی آواز سے بس کے اندر کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ لوگ چیخے بھی تھے۔

مگر قادر بخش کی تمام توجہ اس وقت حیات خان پر تھی۔ حیات اچھل کر درختوں کی طرف بھاگا تھا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر قادر بخش شاٹ گن کی طرف لپکا تھا۔ اس نے گن اٹھاتے ہوئے اس کا چیمبر لوڈ کیا اور مڑ کر بھاگتے حیات پر فائر کیا مگر وہ درختوں میں داخل ہوتے ہوئے بچ گیا تھا۔ اس نے بھی جوابی فائر کیے۔ قادر بخش عقبی طرف درختوں میں بھاگا۔ یہ درختوں کا سلسلہ نیم دائرے میں پھیلا ہوا تھا اگر وہ کھلی جگہ سے جاتا تو حیات خان اسے بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا، درختوں کے درمیان وہ محفوظ رہتا۔ وہ درختوں میں داخل ہو کر اندر ہی اندر اس طرف جانے لگا۔

حیات خان نے بھی خطرہ بھانپ لیا تھا۔ جب قادر بخش دوسری طرف پہنچا تو اس نے حیات کو ڈھلان پر اگی جھاڑیوں میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے اضطراری طور پر فائر کر دیا تھا مگر حیات بچ گیا۔ وہ اب نظروں سے اوجھل تھا۔ قادر بخش ایک درخت کے عقب میں دبک گیا تھا۔ اس کی نظریں ڈھلان پر مرکوز تھیں۔ اسے معلوم تھا، حیات خان اوپر جانے کی کوشش کرے گا اور اس ڈھلان پر وہ زیادہ دیر خود کو روپوش نہیں رکھ سکتا تھا۔ کبھی کبھی جھاڑیاں ہلتی تھیں مگر حیات خان کی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ ایک جھاڑی ہلی تو قادر بخش خطرہ مول لیتے ہوئے ذرا آگے آیا۔ اسے حیات خان کے سرمئی کپڑوں کی جھلک نظر آئی۔ اس نے نشانہ لے کر فائر کیا مگر نشانہ پھر چوک گیا۔ جواب میں حیات خان نے بے تحاشا فائرنگ کی تھی۔ قادر بخش غلبت میں گن لوڈ کر رہا تھا۔

اچانک اسے جھٹکا لگا۔ ایک گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی حالانکہ حیات خان نے نشانہ لے کر فائر نہیں کیا تھا۔ اس نے اضطراری طور پر فائرنگ کی تھی۔ اس کا اندازہ میگزین خالی ہو جانے کے بعد آنے والی کلک کی آوازوں سے ہو رہا تھا۔ قادر بخش لڑکھڑا کر نیچے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا جس سے خون ابلنے لگا تھا۔ زخم وسط میں آیا تھا اور شاید پھیپھڑا متاثر ہوا تھا۔ اس کے منہ سے بھی خون پھوٹ پڑا تھا پھر اس کی نظر ڈھلان پر تیزی سے چڑھتے حیات خان پر پڑی۔ قادر بخش کے اندر گرمی کی لہر اٹھی۔ اس نے شاٹ گن سیدھی کی اور اس بار احتیاط سے نشانہ لینے لگا۔ وہ اس وقت اپنے زخم کو بھی بھول گیا تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا کہ اس بار حیات خان بچ کر نہ جانے پائے۔ وہ اوپری ڈھلان تک جا پہنچا تھا۔ بس ایک لمحے کی دیر تھی، وہ قادر بخش کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ قادر بخش نے سانس روک کر فائر کر دیا اور اسی لمحے حیات خان دوسری طرف کود گیا تھا۔

''کیا اسے گولی لگی ہے؟'' اس نے خود سے پوچھا۔

قادر بخش کو یقین نہیں تھا کہ اسے گولی لگی ہے یا نہیں۔ وہ ہمت کر کے اٹھا۔ خون بہنے کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ ویسے بھی حیات خان کے پاس ..... پستول تھا، گولی زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ وہ ڈھلان پر چڑھنے لگا۔ تکلیف بڑھ رہی تھی اور ناکارہ ہونے سے پہلے وہ اوپر پہنچ کر یقین کر لینا چاہتا تھا کہ حیات خان مارا جا چکا ہے۔ اسے چکر آنے لگے تھے، سینے میں درد بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ بعض جگہ اسے چاروں ہاتھوں پیروں سے جانا پڑا تھا۔ وہ اوپر پہنچا تو اسے دوسری طرف ڈھلان پر خون نظر آیا تھا۔ یعنی حیات خان کو گولی لگی تھی۔ خون کی مقدار بتا رہی تھی کہ زخم بڑا تھا۔ لیکن خود حیات خان کہاں ہے؟ اس نے سوچا۔

قادر بخش ڈھلان سے نیچے آیا۔ خون کے دھبے اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ حیات خان زخمی ہونے کے بعد درختوں کی طرف گیا تھا۔ قادر بخش کے لیے ڈھلان سے نیچے جانا آسان تھا۔ اسے مشقت نہیں کرنا پڑ رہی تھی۔ قدم خود بہ خود اٹھ رہے تھے۔ جب ذہن چکراتا تو اسے لگتا جیسے وہ ہوا میں اڑتا جا رہا ہو۔ اسے خطرہ نہیں تھا کہ وہ نیچے گر جائے گا۔ وہ گر کر بھی نیچے ہی پہنچے گا اور اسے جو نقصان ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ قادر بخش درختوں کے پاس پہنچا۔ اسے ایک درخت کے پاس پھر خون کی خاصی مقدار نظر آئی تھی — جیسے حیات خان کچھ دیر اس جگہ بھی رکا ہو۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا البتہ خون کے دھبے اور قطرے اس کی سمت بتا رہے تھے۔ قادر بخش چند لمحے ستانے کے بعد آگے بڑھا۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ زخمی ہے تو حیات خان بھی زخمی ہے۔ وہ اس سے آسانی سے بھاگ نہیں سکتا تھا، مقابلہ برابر کا تھا۔

درختوں سے نکل کر اسے سامنے والے ٹیلے پر جاتے خون آلود قدموں کے نشانات نظر آئے، اس نے اوپر دیکھا۔ حیات خان نظر نہیں آیا۔ وہ نہ جانے کہاں تھا۔ ممکن ہے اوپر اس کی گھات میں بیٹھا ہو اور جیسے ہی وہ اس کی زد میں آئے وہ اسے گولی مار دے۔ حیات خان کے پاس پستول کی فاضل گولیاں تھیں مگر یہ خیال اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے سینے کا زخم دبائے اور دوسرے ہاتھ سے شاٹ گن تھامے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ ابھی تک اسے خیال نہیں آیا تھا کہ یہ وہی مسجد تھی جس میں حیات خان اس کے پاس آتے ہوئے نماز پڑھتا تھا۔ اوپر چڑھتے ہی اسے حیات خان محراب تلے پڑا نظر آیا تھا۔

قادر بخش شاٹ گن سنبھالے اس کے نزدیک جانے لگا۔ اس بار وہ یقینی طور پر حیات خان کی زندگی کا خاتمہ چاہتا تھا۔ وہ نزدیک آیا تو اسے حیات خان کی دھیمی لیکن صاف آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''— مجھے ایک موقع دے — میرے اللہ۔'' اس کے آخری الفاظ چیخ میں بدل گئے تھے اور اللہ کا لفظ کھنچتا چلا گیا تھا۔ یہ چیخ اتنی تیز تھی کہ قادر بخش گھبرا گیا تھا اور پھر شاٹ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

☆☆☆

فائر کی آواز نے ان کو چونکا دیا تھا۔ رابعہ پہلے ہی کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس نے جب بڑی عمر کے ڈاکو کو اپنی رائفل سیدھی کرتے دیکھا تو اسے ڈاکو کی آنکھوں میں ایک قاتل چمک نظر آئی تھی۔ کسی نے رابعہ کے اندر سے کہا کہ وہ اسے گولی مارنے جا رہا ہے وہ بے ساختہ چیخی۔

''نہیں، اسے مت مارنا۔''

مگر ڈاکو اس سے پہلے ہی گولی چلا چکا تھا۔ رابعہ نے نوجوان ڈاکو کو گرتے دیکھا۔ رابعہ کا خیال تھا کہ اسے گولی لگ گئی ہے مگر وہ قلابازی کھا کر اٹھا اور اس نے اپنے ساتھی پر جوابی فائر کیا۔ رابعہ کو دوسرا ڈاکو نظر نہیں آ رہا تھا۔ فائروں کی آواز سن کر مسافر اپنی نشستوں پر جھک گئے تھے اور بعض تو بس کے فرش پر دبک گئے تھے صرف رابعہ اور سلیم باہر دیکھ رہے تھے۔ نوجوان ڈاکو اب درختوں کی طرف بھاگ رہا تھا۔

''ان میں آپس میں لڑائی ہو گئی ہے۔'' سلیم نے کہا۔

''ہاں — مجھے یقین ہے۔ اس نے اپنے ساتھی کو

UrduPhoto.com

روکنے کی کوشش کی کہ وہ ہمارا سامان نہ لوٹے اور اس نے اپنے ساتھی پر گولی چلادی۔" رابعہ بولی۔

عین اس لمحے سلیم نے سامنے دیکھا۔ اسے بس کی ونڈ شیلڈ کے پار دوسرا ڈاکو درختوں کی طرف جاتا نظر آیا۔ اس نے ذرا دیر کے لیے رک کر ایک فائر اور کیا اور درختوں میں گھس گیا۔ نوجوان ڈاکو نے بھی دو فائر کیے تھے پھر دونوں غائب ہوگئے۔ سلیم نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

"میں اس کی مدد کے لیے جارہا ہوں۔ اس نے صرف ہماری خاطر اپنے ساتھی سے لڑائی کی ہے۔"

"نہیں..... تم نہیں....." رابعہ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے یاد آیا کہ سلیم کے پاس پستول تھا۔

"تم جانتی ہو..... میرے پاس پستول ہے؟" سلیم بولا۔

رابعہ نے سر ہلایا۔ "ہاں اور تم نے اس سے..... اسی نوجوان ڈاکو کو گولی ماری تھی۔" رابعہ نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ سب ناقابل یقین ہے۔ کیا اللہ اس طرح بھی توبہ کی توفیق دیتا ہے۔"

"ہاں..... اس کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔" رابعہ نے یقین سے کہا۔

"اس کے پاس صرف پستول ہے اور اس کے ساتھی کے پاس رائفل ہے۔ وہ اسے مار دے گا۔ مجھے اس کی مدد کے لیے جانا چاہیے۔"

رابعہ ہچکچائی۔ "ٹھیک ہے لیکن میں بھی چلوں گی۔"

"نہیں..... تم نہیں۔"

"پھر تم بھی نہیں جاؤ گے۔"

"رابعہ پلیز..... باہر خطرہ ہے۔" سلیم نے اسے سمجھانا چاہا۔

"خطرہ تمہارے لیے بھی ہے۔ اس لیے ہم دونوں جائیں گے ورنہ کوئی بھی نہیں جائے گا۔"

جس وقت رابعہ اور سلیم آپس میں بحث کررہے تھے، بس کے مسافروں نے فرار کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی نقدی لوٹی جاچکی تھی لیکن ابھی سامان اور جان باقی تھی۔ وہ اسے بچا کر لے جانا چاہتے تھے۔ ایک شخص نے نیچے اتر کر اپنا بیگ اٹھایا اور پہاڑی ڈھلے کی طرف بھاگا تو باقی نے بھی اس کی تقلید کی۔ جن کا سامان ذرا دور تھا وہ سامان چھوڑ کر بھاگے تھے۔ حد یہ کہ ڈرائیور اور کنڈیکٹر بھی فرار ہو گئے اور وہاں صرف سلیم اور رابعہ رہ گئے تھے، وہ نیچے اترے۔ انہوں نے سامان سے اپنے بیگ اور سوٹ کیس اٹھائے۔

"رابعہ! تم سڑک کی طرف جاؤ۔"

"میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ جہاں تم جاؤ گے وہاں میں بھی جاؤں گی۔" رابعہ نے انکار کیا۔

جب وہ نیچے اترے تھے تو ان کو رائفل کے فائر کی آواز آئی تھی۔ سلیم مضطرب ہوگیا۔ "وہ..... وہ اسے مار ڈالے گا۔"

دونوں درختوں سے نکل کر ڈھلان کی طرف بڑھے۔ راستہ ان کا جانا پہچانا تھا مگر جب وہ ڈھلان کے اوپر پہنچے تو دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ "ادھر تو کوئی نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہیں۔" رابعہ بولی اور ڈھلان سے اتر کر مسجد والے ٹیلے کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

"مسجد میں؟"

"ہاں، شاید اللہ ان کو بھی توبہ کی توفیق دے۔" رابعہ نے سر ہلایا۔ "ہمیں دوسری طرف سے جانا چاہیے۔ مجھے یقین ہے، رائفل والے نے ہمیں دیکھ لیا تو گولی چلا دے گا۔"

ٹیلا دائیں طرف سے زیادہ نزدیک تھا مگر وہ دونوں بائیں طرف سے گھوم کر جانے لگے۔ جب وہ ٹیلے کے دامن میں پہنچے تو ان کو خون آلود قدموں کے نشانات اوپر جاتے نظر آئے۔

"ان دونوں میں سے ایک زخمی ہے۔" سلیم نے کہا۔

"اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔"

سلیم نے پستول مضبوطی سے تھام لیا۔ اس نے اپنا بیگ زمین پر رکھ دیا اور رابعہ سے بولا۔ "تم رکو میں اوپر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں..... جب اللہ نے ہمیں توبہ کی مہلت دی ہے تو وہ ہماری حفاظت بھی کرے گا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

سلیم رابعہ کو لے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی اس دلیل نے اسے قائل کرلیا۔ اسے ندامت ہوئی۔ رابعہ ایک کمزور اور نہتی لڑکی ہونے کے باوجود اتنی مضبوطی دکھا رہی تھی۔ اس نے رابعہ کو پیچھے رکھا۔ محتاط اور خاموش قدموں سے وہ ٹیلے کے اوپر پہنچے۔ سب سے پہلے اسے رائفل بردار ڈاکو کی جھلک نظر آئی۔ وہ رائفل تانے سست اور کمزور قدموں سے مسجد کے محراب کی طرف جارہا تھا۔ وہ مزید اوپر آئے، تب انہیں محراب تلے خون میں لت پت نوجوان ڈاکو بھی نظر آیا۔ رائفل والا اس کے پاس جارہا تھا۔ اس کے انداز سے سلیم کو یقین ہوگیا کہ وہ گولی مار کر اس شخص کو قتل کرنے والا تھا جو چند منٹ پہلے تک اس کا ساتھی تھا۔ سلیم نے پستول اس کی

طرف سیدھا کیا مگر اس سے ٹریگر نہ دبا سکا۔ وہ اس پر گولی چلاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا اور شاید یہ احساس بھی اس کا ہاتھ روک رہا تھا کہ وہ خانہ خدا میں کھڑا ہے۔ وہ اللہ کے گھر میں کسی پر گولی کیسے چلا سکتا تھا مگر دوسری طرف اسے اپنے محسن کی جان بھی بچانا تھی۔ اس کا سابقہ ساتھی اسے بغیر کسی احساس کے گولی مار دیتا۔

"یہ بھی زخمی ہے۔" عقب سے رابعہ نے سرگوشی میں کہا۔

ایک لمحے کو سلیم اچھل پڑا تھا پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"اس کے پیر دیکھو۔"

سلیم نے غور سے رائفل بردار کے پیروں کی طرف دیکھا۔ اس کے پاؤں کے خون آلود نشانات زمین پر بن رہے تھے۔ لگتا تھا اسے بھی اپنے سابقہ ساتھی کی گولی لگی تھی لیکن نوجوان ڈاکو کی حالت واضح طور پر خراب نظر آرہی تھی۔ اتنا خون کسی بڑے زخم سے نکل سکتا تھا۔ رابعہ بولی۔

"سلیم! کچھ کرو ورنہ یہ اسے گولی مار دے گا۔"

سلیم نے پھر پستول سیدھا کیا اور سانس روک کر اس کے پاؤں کا نشانہ لینے لگا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی انسان پر قتل کے ارادے سے گولی چلاتا، چاہے وہ کوئی خوں خوار ڈاکو ہی کیوں نہ ہو لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا اسے محراب کی طرف سے روشنی کا احساس ہوا۔ دن نکلا تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور محراب والا حصہ پوری طرح دھوپ میں تھا۔ اس کے باوجود یہ ایسی روشنی تھی جس نے سلیم اور رابعہ کو چونکا دیا۔ یہ روشنی دودھیا تھی اور رفتہ رفتہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ اس کا مخرج کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔

"یا اللہ!" رابعہ کے منہ سے نکلا تھا۔

روشنی اچانک اتنے تیز جھماکے میں بدلی کہ وہ بے ساختہ آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ رابعہ ڈر کر اس کے بازو سے چمٹ گئی تھی۔ روشنی کی کرنیں بند آنکھوں میں بھی آئی تھیں مگر یہ سورج کی روشنی کی طرح تکلیف دہ نہیں تھیں بلکہ ان میں ٹھنڈک کا احساس تھا۔ جب انہیں محسوس ہوا کہ روشنی ختم ہوگئی ہے تو انہوں نے آنکھیں کھولیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ محراب تلے والی جگہ خالی تھی جہاں ایک لمحے پہلے تک نوجوان ڈاکو پڑا تھا۔ وہاں اب کچھ نہیں تھا، حد یہ کہ خون بھی غائب تھا۔ رائفل بردار ایک طرف بائیں ہاتھ سے زمین پر ٹکا ہوا تھا اور اس کی شاٹ گن نیچے پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

"وہ کہاں گیا؟" رابعہ نے بے ساختہ سلیم سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" سلیم کہتے کہتے رکا پھر ہچکچایا۔ "رابعہ اس کے ساتھ بھی ہمارا والا معاملہ تو نہیں ہوا ہے؟ وہ بھی....."

"لیکن ہم تو اسی جگہ پر ہیں۔" رابعہ نے اس کی بات کاٹی۔

"میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے۔" سلیم نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ ماضی میں جاچکا ہے۔"

اسی اثنا میں قادر بخش نے ان کو دیکھ لیا۔ وہ چونکا اور اس نے شاٹ گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سلیم نے اس کی طرف پستول سیدھا کرلیا۔ "خبردار! حرکت مت کرنا۔"

قادر بخش رک گیا۔ سلیم نے آگے آکر شاٹ گن پاؤں کی ٹھوکر سے دور کردی۔ قادر بخش کی حالت خراب ہورہی تھی۔ وہ زمین پر نیم دراز ہوگیا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا تھا..... حیات خان کہاں گیا؟"

"اس کا نام حیات خان تھا۔" سلیم بولا۔ "وہ ماضی میں چلا گیا۔"

قادر بخش نے الجھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو..... میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھا تو میں بھی نہیں ہوں۔" سلیم نے گہری سانس لی۔ "کیا تم یقین کرو گے؟ میں نے زندگی کا یہ حصہ دو بار گزارہ ہے، جب تم اور حیات خان ڈاکے کے لیے بس میں سوار ہوئے تھے۔ پہلی بار میں نے اپنا قیمتی سامان تم سے بچانے کی کوشش کی تب تم نے مجھے گولی مار کر زخمی کردیا تھا۔ میں تم سے بچنے کے لیے بھاگا اور اس مسجد تک آگیا پھر میں محراب کے نیچے بے دم ہو کر گر گیا تھا۔ موت مجھے سامنے نظر آنے لگی تھی۔ تب میں نے اللہ سے اپنے گناہوں پر توبہ کی اور کفارے کی مہلت مانگی۔"

قادر بخش طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "اور تم کو مہلت مل گئی؟"

"ہاں..... میں بے ہوش ہوگیا تھا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں بس میں اپنی نشست پر بیٹھا تھا اور تم دونوں بس میں داخل ہورہے تھے۔"

"مجھے یقین..... نہیں آرہا۔"

"ابھی تم نے اپنے ساتھی کو غائب ہوتے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت زندہ ہوگا..... اور اگر تم نے سنا ہو تو وہ اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ رہا ہوگا۔"

"ہاں..... وہ خدا سے مہلت مانگ رہا تھا۔"

"تب تم بتا سکتے ہو..... وہ کہاں گیا؟"

UrduMotto.com

☆☆☆

"حیات خان!" ٹھیکیدار کا منیجر قربان اس سے کہہ رہا تھا۔ "اس پر دستخط کرو۔"

حیات خان چونکا تھا۔ وہ منیجر کے خیمے میں تھا۔ اس کے عقب میں مزدوروں کی قطار کھڑی تھی جو اپنی تنخواہیں وصول کرنے آئے تھے۔ قربان کا چپچپ خاص غرایا۔ "تجھے سنائی نہیں دیتا..... دستخط کر جلدی سے۔"

حیات خان نے ہاتھ میں دبی رقم دیکھی اور اسے قربان کے سامنے رکھ دیا۔ "مجھے تمہاری تنخواہ نہیں چاہیے..... میں دستخط نہیں کروں گا۔"

"تیرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔" قربان غرایا تھا۔

"نہیں..... میں نے کہا نا مجھے تمہاری تنخواہ نہیں چاہیے۔"

حیات خان قطار سے نکل کر جانے لگا۔ پیچھے سے قربان نے پکارا۔ "اوئے..... کیا بھوکا مرے گا؟"

حیات خان رکا پھر واپس مڑا۔ "تم میرے رازق نہیں ہو۔ میرا رازق اللہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی مجھے رزق بھی دے گا۔"

"اوئے بڑا مولوی بن رہا ہے۔ چل نہ لے..... پر بھوکوں مرنے لگے تو میرے پاس آجانا۔"

حیات خان اس کے خیمے سے نکل آیا۔ وہ اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔ سامان کیا تھا ایک پرانا سا اٹیچی کیس تھا اور چند جوڑے تھے، اس نے وہی الگنی سے اتار کر اٹیچی کیس میں رکھ لیے۔ وہ سوچ رہا تھا کیا اس نے جو دیکھا وہ سچ تھا یا کوئی خواب..... مگر اسے یقین تھا، وہ خواب نہیں تھا پھر اسے وہ لڑکا لڑکی یاد آئے۔ سلیم اور رابعہ..... ان کی باتیں کتنی عجیب تھیں۔ انہوں نے اسے اندر سے بدل دیا تھا۔ وہ بھی برے راستے پر جا رہے تھے اس کی طرح..... اور اسے یاد آیا، ان دونوں میں سے کسی نے مسجد کا ذکر کیا تھا۔ بھلا ان کو اس مسجد کے بارے میں کیا پتا تھا؟..... کیا وہ بھی کسی ایسے ہی تجربے سے گزر چکے تھے؟

کتنی حیرت انگیز حقیقت ہے کہ وہ مرنے والا تھا۔ اس نے اللہ سے توبہ کی اور مہلت چاہی اور اسے مہلت اس انداز میں مل گئی۔ وہ بیٹھا سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا جس نے اسے مہلت ہی نہیں دی تھی بلکہ اسے وہ زندگی پھر سے گزارنے کا موقع بھی دیا تھا جسے وہ اب تک گناہوں میں ضائع کرتا آیا تھا۔ اس کے خیمے کے ساتھی آئے۔ انہوں نے اپنی تنخواہیں لے لی تھیں۔ ایک نے اسے ملامت کی۔ "حیاتے..... یہ کیا پاگل پن کیا ہے؟ اپنی مزدوری چھوڑ آیا۔ اب گزارہ کیسے کرے گا؟"

"میں نے پوری محنت کی۔ تم لوگ گواہ ہو، اپنے کام میں ایک منٹ کی غفلت بھی نہیں کی پھر مجھے اپنی محنت کا معاوضہ بھی پورا چاہیے۔"

"یہاں کسی کو پورا معاوضہ ملا ہے جو تجھے ملے گا۔"

"تب میں ادھورا معاوضہ کیوں لوں..... مجھے تو اللہ سے چاہیے۔ مجھے یقین ہے، وہ مجھے پورا ہی دے گا۔"

اس کے ساتھیوں نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ "اب کیا کرے گا؟"

"کیا کروں گا! میں راولپنڈی چلا جاؤں گا۔ وہاں محنت مزدوری کروں گا۔"

"تیرے پاس پیسے ہیں؟" ایک نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ہاں اتنے ہیں تین چار دن آرام سے کٹ جائیں گے۔" وہ بولا اور اٹیچی سنبھالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "ایک درخواست ہے دوستو! شاید یہاں قادر بخش نامی ایک شخص میرا پوچھتا ہوا آئے۔ اسے کہنا کہ حیات خان مر گیا ہے، اسے دفنا دیا گیا ہے۔"

وہ خیمے سے باہر آیا اور اٹیچی کیس سنبھالے جی ٹی روڈ کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھیوں نے ساتھ آنا چاہا لیکن اس نے منع کر دیا۔ "میں چلا جاؤں گا یارو!"

وہ بس کا انتظار کرنے لگا۔ بس تو نہیں آئی ایک پک اپ آکر اس کے پاس رکی۔ اس کے عقبی حصے میں بند گوبھی بھری ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا۔

"کدھر جانا ہے جوان؟"

"راولپنڈی تک۔" اس نے کہا۔

"آجاؤ..... میں سبزی منڈی تک جا رہا ہوں۔" اس نے دوسری طرف سے دروازہ کھول دیا۔

حیات خان اس کا شکریہ ادا کر کے پک اپ میں آبیٹھا۔ ادھیڑ عمر آدمی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ "میرا نام محمد حیات ہے۔" اس نے تعارف کرایا۔

حیات خان مسکرایا۔ "بندے کو حیات خان کہتے ہیں۔"

"پھر تو ہمارا نام ایک ہوا۔ کس کام سے جا رہے ہو؟"

"مزدور ہوں جی..... مزدوری کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

"اچھا..... میرا ادھر چھوٹا سا فارم ہے، سبزی لگاتا ہوں۔ مجھے بھی ایک آدمی چاہیے۔ زمین پر کام کرنے کا تجربہ ہے؟"

"بچپن سے جی زمین پر کام کیا ہے۔ اب زمین نہیں رہی، اس لیے مزدوری کرنے جا رہا ہوں۔"

"اوہ..... اچھا میرے ساتھ کام کرو گے؟ معاوضہ اچھا

اب آپ Mobilink، Ufone، Warid کے ساتھ ساتھ
Telenor سے بھی 78601 ڈائل کیجئے اور انجوائے کیجئے ٹیلی فن کی سروسز
Telefun
• تازہ ترین خبریں
• پسندیدہ گانے
• موبائل فرینڈشپ
• مکڈونلڈز میل
• DVD موویز
• انٹرنیٹ گھنٹے
• بے شمار کیش انعامات
صرف ایک فون کال پر
PTCL سے ڈائل کیجئے 0900-78601 موبائل سے ڈائل کریں 78601
ٹیلی فن کی سروسز کے بارے میں مکمل معلومات، رہنمائی اور کسی بھی قسم کی شکایت کیلئے ڈائل کریں
ٹول فری نمبر 0800-78601 اس نمبر پر کی جانے والی تمام کالز کے چارجز ٹیلی فن ادا کرے گا۔
for more information visit: www.telefun.com.pk
Call Rate 14.07/min.
Ad Creator

دوں گا۔ کھانا اور رہائش بھی میرے ذمے ہوگی۔"

"کیوں نہیں جی..... کام کے لیے تو نکلا ہوں۔"

"بس تو میرے ساتھ واپس چلنا۔" محمد حیات نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

حیات خان نے ایک بار پھر دل ہی دل میں خود کو اللہ کے شکر میں مشغول پایا جس نے اسے ایک دن بھی بے روزگار رہنے نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

سوال یہ نہیں تھا کہ حیات خان کہاں گیا تھا بلکہ اب ان کے نزدیک سوال یہ تھا کہ وہ کہاں جائیں؟ قادر بخش مشکوک انداز میں ان کو دیکھ رہا تھا۔ "تم دونوں گھر سے بھاگے ہوئے ہو نا؟"

رابعہ چونکی اور سلیم پریشان ہو گیا تھا۔ "نہیں، تمہارا اندازہ غلط ہے۔"

وہ ہنسا۔ "قادر بخش کا اندازہ کم ہی غلط ہوتا ہے۔"

رابعہ بولی۔ "سلیم! ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم کہاں جا سکتے ہیں..... سڑک پر اب تک پولیس آ چکی ہوگی یا آنے والی ہوگی۔"

"اور اس کے بعد تم دونوں حدود آرڈی نینس کے تحت اندر ہو گے۔" قادر بخش بولا۔

"نہیں۔" رابعہ لرز گئی تھی۔ "میں یہ بدنامی برداشت نہیں کر سکتی..... میرے ماں باپ مر جائیں گے۔"

"یہ..... بات..... گھر سے..... قدم نکالنے سے..... پہلے سوچتیں۔" قادر بخش نے رک رک کر کہا۔

سلیم نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے زخم کا معائنہ کیا۔ گولی دائیں طرف پھیپھڑے میں گھس گئی تھی اس لیے جب وہ سانس لیتا تھا تو زخم سے خون آلود بلبلے اٹھتے تھے۔

"یہ مر رہا ہے۔" سلیم نے رابعہ سے کہا۔

"سنو..... کیا تم توبہ نہیں کر سکتے۔" رابعہ نے اس سے کہا۔ "یقین کرو، جو اس مسجد میں سچے دل سے توبہ کرتا ہے اللہ اسے معاف کر دیتا ہے..... اسے مہلت دیتا ہے۔"

"توبہ تو وہ کہیں بھی قبول کر لیتا ہے لیکن سچی بات ہے، میرے اندر وہ بات ہی نہیں ہے۔" قادر بخش افسردگی سے بولا۔ "میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔"

"تم ایک بار توبہ کر کے تو دیکھو۔" سلیم نے بھی اصرار کیا۔ "ممکن ہے اللہ تمہیں معاف کر کے مہلت دے دے۔ تم بھی ماضی میں چلے جاؤ..... اس گناہ آلود زندگی کے بجائے عام زندگی بسر کرو۔"

"میں عام زندگی..... نہیں گزار سکتا۔" قادر بخش نے کہا۔ "اگر تم پھر بھی اصرار کر رہے ہو تو مجھے محراب کے نیچے لے چلو۔"

سلیم نے بھاری بھرکم قادر بخش کو سہارا دے کر اٹھایا اور اسے محراب تلے لا کر بٹھا دیا۔ اس کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی، وہ بیٹھنے کے بجائے لیٹ گیا۔

رابعہ، سلیم کے ساتھ تھی۔ قادر بخش کوشش کر کے اوندھے منہ لیٹ گیا۔ وہ آہستہ سے کچھ کہہ رہا تھا جو ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ رابعہ اور سلیم پیچھے ہٹ گئے تھے۔

"اس دنیا میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو ہم نہیں جانتے۔" سلیم نے گہری سانس لی۔

"مگر یہ کوئی نہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ دراصل ہماری عقل واقعات کے ہونے کا طریقہ کھوجتی ہے۔ اس کی وجہ کی طرف توجہ نہیں دیتی۔"

"سلیم! کیا پولیس ہمیں گرفتار کر لے گی؟" رابعہ سہم گئی تھی۔

"شاید..... یا شاید ہم بچ جائیں۔"

"سلیم ہم نے تو توبہ کی ہے..... تو کیا اللہ نے ہماری توبہ قبول نہیں کی؟"

"اگر ایسا ہوتا تو اس وقت ہم یہاں نہ ہوتے۔ رابعہ! اس نے ہماری توبہ قبول کر لی ہے۔"

وہ قادر بخش کو دیکھ رہے تھے جواب ساکت تھا۔ پتا نہیں وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ اس نے نہ جانے توبہ کی تھی یا نہیں۔ اچانک درختوں کی جانب سے ہلکی سی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

"وہ ہمیں تلاش کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔" رابعہ گھبرا گئی تھی۔

سلیم نے ٹیلے سے نیچے جھانکا۔ کچھ افراد یقیناً درختوں میں تھے پھر کسی نے کرخت لہجے میں کہا۔ "ادے دیکھو..... ڈاکو اور وہ لڑکا لڑکی ادھر ہی ہوں گے۔"

"یہ تو پولیس والے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "وہ ہمیں تلاش کر لیں گے۔"

سلیم بھی پریشان ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پولیس کے ہاتھ آ جاتے تو انہیں اور ان کے خاندان کو دنیا کی کوئی طاقت بدنامی سے نہیں بچا سکتی تھی۔ وہ پیچھے ہو گئے۔ ٹیلے سے نیچے جانے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ اس سے نیچے جاتے تو براہ راست پولیس سے سامنا کرنا پڑتا۔

"اب کیا کریں؟"

سلیم کے پاس رابعہ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں

تھا۔ وہ مسجد کی طرف مڑا تو اس کا خالی محراب دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ اسے حیران دیکھ کر رابعہ نے بھی محراب کی طرف دیکھا اور قادر بخش کو وہاں سے غائب پا کر اچھل پڑی تھی۔

"یہ بھی گیا!"

"ہاں..... اور ہم پھنس گئے۔" سلیم نے سرد آہ بھری۔

"ابھی ہم پھنسے نہیں ہیں..... ابھی موقع ہے، ہم بچ سکتے ہیں۔"

"کوئی موقع نہیں ہے۔" سلیم نے مایوسی سے چاروں طرف دیکھا۔ "ٹیلے سے اترنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر ہم پولیس سے بچ کر نکل بھی گئے تو ہمارا سامان ٹیلے کے نیچے پڑا ہے، وہ پولیس کے ہاتھ لگ جائے گا۔"

"نہ ہم پولیس کے ہاتھ لگیں گے اور نہ ہمارا سامان ان کو ملے گا۔" رابعہ یقین سے بولی۔

"وہ کیسے؟" سلیم الجھ کر بولا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" رابعہ محراب کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"وہ ڈاکو کہاں گیا؟"

رابعہ رکی۔ "اسے ڈاکو مت کہو..... اللہ نے اس کی توبہ قبول کر لی ہے تبھی اسے ماضی میں بھیج کر تلافی کا موقع دیا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوگا، مجھے یقین ہے کہ اب جرم کی راہ پر نہیں چلے گا۔"

☆☆☆

رابعہ دروازے پر کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی آگے جائے یا نہ جائے۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا جس میں اس کے کپڑے اور زیورات تھے پھر وہ چونکی، اسے خیال آیا۔ میرے اللہ! کیا وہ سب خواب تھا؟ لیکن انسان ایسے کیسے خواب دیکھ سکتا ہے؟ کیا وہ جاگتے میں خواب دیکھتی رہی تھی؟ اس نے سوٹ کیس واپس رکھا اور پلٹ کر گلی میں آئی۔ اس کا رخ سلیم کے مکان کی طرف تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس کا یقین درست تھا، سلیم اپنے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔

"سلیم!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"رابعہ!" وہ بے تابی سے بولا۔

"سلیم یہ سب حقیقت ہے نا؟"

"ہاں، یہ حقیقت ہے۔" وہ بولا۔ "اللہ نے ہمیں توبہ کا موقع دیا ہے۔"

"سلیم! اب میں تم سے نہیں ملوں گی۔ ہاں، ہمارے نصیب میں ملنا ہوا تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔"

"ہاں اگر ہمارا مقدر ہوا تو....." سلیم نے سرد آہ بھری۔

"اللہ حافظ۔" رابعہ بولی۔

"اللہ حافظ۔" سلیم نے جواب دیا اور رابعہ اپنے دروازے کی طرف چلی گئی۔ جب وہ دروازے تک پہنچی تو سلیم بھی بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ اسے اپنے دوست کو منع کرنا تھا۔ ان کو گرنے سے پہلے ہی سنبھلنے کا ایک موقع مل گیا تھا۔

☆☆☆

قادر بخش کچھ دیر کے لیے ساکت کھڑا رہا تھا۔ اسے شبہ ہو رہا تھا کہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہے لیکن اتنا عجیب خواب.....! اس نے سوچا۔ وہ سڑک سے ذرا فاصلے پر سرخ چٹان کے پاس کھڑا تھا اور حیات خان کا انتظار کر رہا تھا..... اس حیات خان کا جسے وہ گولی مار چکا تھا اور وہ مرنے سے پہلے اس کی نظروں کے سامنے غائب ہو گیا تھا۔

"کیا وہ آئے گا؟" اس کے اندر سوال ابھرا۔

سورج کی روشنی نمودار ہو کر رفتہ رفتہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ حیات خان نہیں آیا البتہ راولپنڈی کی جانب سے بس نمودار ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی قادر بخش سڑک کی جانب دوڑا۔ جب تک وہ سڑک کے کنارے پہنچا، بس بالکل نزدیک آ چکی تھی۔ اس نے ونڈ شیلڈ کے عقب میں موجود ڈرائیور کی صورت دیکھی۔ اس کے اندر سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ وہی ڈرائیور تھا۔ اس کے ساتھ کنڈیکٹر بھی کھڑا تھا۔ بس اس کے سامنے سے سبک رفتاری سے گزری۔ اس نے بے اختیار درمیانی نشستوں کی طرف دیکھا جن پر وہ لڑکا اور لڑکی بیٹھے تھے مگر ان نشستوں پر کوئی نہیں تھا۔ دونوں نشستیں خالی تھیں۔ اس نے جو دیکھا تھا وہ سچ تھا، خواب نہیں تھا۔

قادر بخش لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ "تو یہ سچ ہے۔" اس نے خود سے کہا۔ "میرے اللہ نے مجھے معاف کر دیا..... مجھ گناہ گار کو معاف کر دیا۔"

قادر بخش کے آنسو پھوٹ پڑے تھے۔ اسے پتا نہیں چلا..... وہ روتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔

"اللہ نے مجھ گناہ گار کو معاف کر دیا ہے۔"

اس نے سڑک کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا پھر سڑک پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ چلتے چلتے اس کے قدم رکے تو وہ مسجد والے ٹیلے کے نیچے تھا۔ وہ نہ جانے کب یہاں تک آ گیا، اسے پتا ہی نہیں چلا اور نہ ہی وہ یہاں آنے کا سوچ کر چلا تھا۔ یہ تو اس کے پاؤں تھے جو اسے بلا ارادہ یہاں لے آئے تھے۔ وہ لرزتے قدموں سے اوپر چڑھنے لگا۔ شکستہ

UrduPhoto.com

مسجد کی محراب کے سامنے آتے ہی وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ مسجد ویرانہ اس کے رونے کی آوازوں سے آباد ہوگیا۔ محراب تلے وہ سجدے میں گر کر نہ جانے کتنی دیر روتا رہا تھا۔ جب اس کا دل ہلکا ہوا تو اس نے ٹیلے سے اتر کر ایک گڑھے میں جمع بارش کے پانی سے وضو کیا اور واپس مسجد میں آ کر دو رکعت نماز پڑھی اور دعا مانگنے لگا۔ ''اے اللہ! جب تو نے مجھے توبہ کی توفیق دی ہے تو مجھے اس پر قائم رکھ اور مجھے حلال ذریعے سے روزی دے۔''

دعا مانگ کر وہ اٹھا۔ اس نے مسجد کی صفائی کی اور ٹیلے سے اتر کر سڑک کی طرف جانے لگا۔ راستے میں ایک گڑھے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی رائفل اور اس کی فاضل گولیاں اس میں پھینک دیں۔ سڑک کے کنارے آ کر وہ بلا ارادہ راولپنڈی کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آئندہ اس کا ذریعہ روزگار کیا ہوگا۔ اللہ سے حلال ذریعے سے روزی کی دعا مانگ کر وہ اندر سے بڑا پرسکون تھا۔ دن چڑھنے کے بعد جی ٹی روڈ پر گاڑیوں کی آمد و رفت تیز ہوگئی تھی۔ ایک پک اپ اس کے برابر سے گزری پھر ذرا آگے جا کر اس کے بریک لگے۔ قادر بخش پک اپ کے پاس پہنچا تو اس کے ڈرائیونگ کیبن سے آواز آئی۔

''قادر بخش..... لفٹ چاہیے۔''

قادر بخش اپنے سامنے حیات خان کو پا کر دم بہ خود رہ گیا تھا۔ ''حیات خان تو.....''

حیات خان پک اپ سے اتر کر اس سے لپٹ گیا تھا۔ ''تو زندہ ہے..... اللہ کا شکر ہے۔''

''میں آج تیرا انتظار کرتا رہ گیا اور تو اب آیا۔'' قادر بخش کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

''قادر! میں تو پانچ برس پہلے ہی نہیں آیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری توبہ قبول کر کے میری زندگی کے یہ پانچ سال مٹا دیے اور مجھے پھر سے موقع دیا۔ میں نے پانچ سال سے حرام کا ایک پیسا بھی نہیں کمایا۔ اس پر بھی اللہ نے مجھے اتنا نوازہ کہ میں حیران ہوں۔ آج میرے پاس دس ایکڑ زمین ہے، اس پر اپنا گھر ہے۔ میری بیوی ہے..... اور بیوی پتا ہے کون ہے؟ میری تایا زاد جسے میں پسند کرتا تھا۔ جب میرے پاس زمین اور پیسا آ گیا تو اس کے گھر والے بھی مان گئے۔''

''حیاتے..... خدا نے مجھے بھی توبہ کی توفیق دی..... پر بس آج کی حد تک..... میں نے وہ بس چھوڑ دی۔ میں نے ان لڑکا لڑکی کے کہنے پر مسجد کی محراب تلے خدا سے معافی مانگی اور جب میری آنکھ کھلی تو میں سرخ چنان کے پاس کھڑا تیرا انتظار کر رہا تھا۔ بس میرے سامنے سے گزری تھی۔ پر یار عجیب بات ہے کہ وہ لڑکا اور لڑکی اس بس میں نہیں تھے۔''

حیات خان نے گہری سانس لی۔ ''لگتا ہے ان کی توبہ بھی قبول ہوگئی۔ ہم سے پہلے ان کی توبہ قبول ہوئی تھی۔''

''بھی وہ اس بس میں نہیں تھے۔'' قادر بخش نے کہا۔ ''میں نے آج سے جرم کی راہ چھوڑ دی ہے۔''

''تو کہاں جا رہا ہے؟''

''میں شہر جانے کا سوچ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں محنت مزدوری کروں گا۔ مجھے کوئی اور کام آتا بھی نہیں ہے۔''

''تو کہیں نہیں جائے گا، میرے ساتھ چلے گا۔ میرے ساتھ کام کرے گا اور آمدنی میں سے آدھا تیرا ہوگا۔'' حیات خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

قادر بخش نے سوچا اور انکار کر دیا۔ ''میں تیرے اوپر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ میں حلال روزی اپنے زور بازو سے کمانا چاہتا ہوں۔''

''تو میرے اوپر کیوں بوجھ بننے لگا۔'' حیات خان نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''اپنی محنت کی کھائے گا..... اور تیرا مجھ پر قرض ہے۔''

''کیسا قرض؟''

''ایک وقت تھا جب تو نے فراخ دلی سے مجھے اپنی حرام کی کمائی میں برابر کا حصے دار بنا لیا تھا تو کیا آج میں تجھے اپنی حلال کی کمائی میں برابر کا حصے دار نہیں بنا سکتا۔ کیا تو مجھے اللہ کا شکر ادا کرنے کا موقع نہیں دے گا؟''

''اللہ کا شکر؟'' قادر بخش نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''ہاں، اللہ کا شکر تو اس طرح ہی ادا کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جو نعمتیں دی ہیں ان میں دوسروں کو شریک کریں..... اور تجھ سے زیادہ اور کون میرے قریب ہے۔ تیرا مجھ پر سب سے زیادہ حق ہے۔''

قادر بخش نے سوچا۔ ''مجھے منظور ہے..... پر شرط یہ ہے..... میرا صرف آمدنی پر حق ہوگا۔ تیری زمین اور مکان تیرے بیوی بچوں کا حق ہے۔''

حیات خان مسکرایا۔ ''مجھے بھی منظور ہے۔''

دونوں گرم جوشی سے ایک دوسرے کے سینے سے لگ گئے تھے۔